

مالا (نمرہ احمد)

”کمہ“

باب دوم

قط نمبر: ۸

ہمارے خواب ہمیں لے جاتے ہیں
 مزید نئے خوابوں کی طرف
 اور اس سراب کا کوئی اختنا نہیں ہوتا۔
 زندگی ایک ریل گاڑی ہے بدلتے مزاج کی
 جیسے ہو موتیوں کی ایک مala
 اور جیسے جیسے ہم ہر ایک موتی سے گزرتے ہیں
 ہم دیکھتے ہیں کہ سارے موتی
 دراصل مختلف رنگوں کے عد سے ہیں
 وہ دنیا کو اپنے رنگ میں دکھاتے ہیں
 اور ہر عد سے وہی دکھاتا ہے
 جو اس کی نظر کے سامنے ہوتا ہے۔
 پہاڑ سے ہم صرف پہاڑ دیکھ سکتے ہیں۔
 ہم اسی کی تصویر بناتے ہیں جس کی بنا سکتے ہیں
 اور ہم وہی دیکھتے ہیں جسے ہم نے خود بنایا ہوتا ہے۔
 فطرت اور کتابوں کو کیسے پڑھنا ہے
 یہ رضی ہے دیکھنے والی آنکھ کی۔

انسان کیا دیکھے گا آسمان پر؟

ڈوبتا سورج؟

یا کوئی نظم؟

یہ منحصر ہے اس کی فطرت پر۔

ڈوبتے سورج ہر روز ہوتے ہیں

اور نظموں کو لکھنے کی عقل بھی

ہمیشہ ساتھ ہوتی ہے۔

لیکن ان دونوں کو دیکھنے کے لیے

بس چند گھنٹیاں ہی ہوتی ہیں۔

اور پھر یہ ڈوب جاتے ہیں۔

انسان کی فطرت وہ لو ہے کی تاریخ

جس پر موتیوں کی یہ مala پروائی ہوتی ہے۔

کیا فائدہ صلاحیت یا خوش قسمتی کا

اگر فطرت ہی سردار مسخر شدہ ہو؟

کیا فائدہ عقل کا

اگر اس کا وعدہ اتنا موٹا ہو

کہ انسان اپنی زندگی کا آسمان نہ دیکھ سکے؟

کیا فائدہ نئے وعدے کرنے کا

اگر بھانے والا ہی قانون شکن ہو؟

ہم دیکھتے ہیں نوجوانوں کو

جو ہم سے ایک نئی دنیا کا وعدہ کرتے ہیں

وہ اس کا سراب دکھاتے ہیں

اسے بہت شاندار بنائے

لیکن وہ اس قرض کو کبھی ادا نہیں کر پاتے
وہ جلد مر جاتے ہیں
اور حساب سے بچ جاتے ہیں۔

یا اگر وہ رہیں زندہ تو
وہ دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔

(ریلف و یلڈ وایرس کے مضمون "تجربے" سے مأخوذه)

ریستوران کی چھت سے کرٹل بالز کی شکل کے بلب لٹک رہے تھے۔ سارے کو ہلکے نیلے اور سفید رنگ سے سجا گیا تھا۔ میزوں پہ اجلے سفید رو مال بچھے تھے۔ مرکزی دیوار کے ساتھ ایک بے نیاز آرٹسٹ بیٹھا والکن بجرا رہا تھا۔ اس کی آواز میں ویژہ کی چاپ، کٹلری کی چھنک، مدمہ سر گوشیوں اور ہلکے قہقہوں کی آمیزش بھی سنائی دیتی تھی۔ ایسی ہی ایک میز پہ بیربل فرید بر اجمن تھا۔ اس کے گھنگھری یا لے بال جیل سے پچھے جئے تھے۔ بنائائی کے سیاہ سوت پہنے، وہ ٹیک لگا کے بیٹھا، انگلیوں میں کرٹل کی سجاوٹی گیند کو گھما تے ہوئے ادا سی سے کھبر رہا تھا۔

"اور پھر میرے فادر کی ڈی تھر ہو گئی۔ چونکہ میں اکلوتا بیٹھا تھا، اس لیے وہ ساری ذمہ داری میرے کندھوں پہ ڈال کے چلے گئے۔" کہتے ہوئے اس نے پلکیں جھکا لیں۔

"بچ...." سامنے بیٹھی لڑکی نے فکر مندی سے پہلو بدلا۔ اس کے بال جوڑے میں بند ھے تھے اور دو لیں سامنے گرتی تھیں۔ لمبی گردن میں نیکلیں تھا اور خوبصورت آنکھوں میں بے پناہ ہمدردی۔

"تم کتنے اکیلے ہو گے۔" اس نے انگوٹھیوں والا مرمریں ہاتھ بڑھا کے اس کے ہاتھ پر رکھا۔

بیربل نے پلکیں اٹھائیں۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پھر وہ افسوس سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"اکیلا کہاں ہوں؟ اتنا بڑا کاروبار اور اس کے مسئلے میرے ساتھ ہیں۔" گھری ٹھنڈی سانس کھینچی۔ "صحیح اپنی آرکٹیک پھر ل فرم دیکھا ہوں۔ شام میں بیکری۔ پھر لندن کے کاروبار کے مسئلے۔ اُف۔" جھر جھری لی۔

"کیا کرتے تھے تمہارے فادر؟" لڑکی نے اپنا ہاتھ نا محسوس انداز میں واپس کھینچا اور سفید اور نیلی پلیٹ قریب کھسکائی جس میں ڈیز رٹ رکھا تھا۔

”ہماری انویسٹمنٹ پیچمئٹ فرم ہے۔ انہوں نے اسے لندن اور قطر میں شروع کیا تھا اور....“ گردن قدرے کڑائی۔ ”میں اسے یہاں استنبول لایا ہوں۔“

”واو۔“ لڑکی نے سلوو کے پیچے سے ڈیزرت ذرا سا اٹھایا اور منہ میں رکھا۔ نظریں اسی پہ جھی تھیں۔

”اور کیا ہاپیز ہیں تمہاری؟“

بیربل عاجز انداز میں مسکرا یا۔

”ان سب جھمیلوں میں اپنے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ ایک سگار کا شوق تھا۔ لیکن میرے والد کو پسند نہیں تھا۔ ان کے لیے وہ بھی چھوڑ دیا۔“

”تمہارے والد کو تم پہنچ رہے ہو گا۔“ وہ بہت اپنا بیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”اوکس چیز کا شوق ہے؟“ اوپر سے لٹکتی کر مثل بازار میں ان کی میز کا عکس الٹا ہو کے دکھائی دے رہا تھا۔

”بانیکس کا شوق تھا مجھے۔ لیکن پھر (ٹھنڈی سانس) ایک ایکسٹریٹ میں میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔“

”پیچ...“ اس نے فکر مندی سے پیچ نیچے رکھا۔ ”رات یا یفٹ؟“ ”کیا؟“

”رات ٹانگ ٹوٹ یا یفٹ؟“

”رات... رات۔“ وہ سنجل کے مسکرا یا۔ ”بس اس کے بعد سے بانیکس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ حالانکہ وہ آج بھی میرے گیراج میں کھڑی ہیں۔“

سفید میز پوش پر رکھا اس کا فون ایک دم زوں زوں کرنے لگا۔ ماحول کا سارا فسوس ٹوٹ گیا۔ بیربل نے نظر جھکا کے دیکھا۔ فیضی خانم کا لنگ۔ اس نے پاور بیٹن کو دو دفعہ دبایا۔ کال کٹ گئی اور فون خاموش ہو گیا۔

”ویک اینڈ پہ بھی میری سیکرٹری چین نہیں لینے دیتی۔“ وہ پھر سے مسکرا کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ لڑکی نے مسکرا کے سر جھکا۔

”تمہارے جیسے آدمی کے بھی مسئلے ہوتے ہیں۔“

”تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم یہاں....“

فون پھر سے وابستہ رہنے لگا۔ اس نے ضبط سے پہلو بدلا۔

”ایکسکیوزمی۔“ پھر موبائل کان سے لگاتے ساتھ ہی بولا۔

”فیضی حامم... میری آج کی ساری میٹنگز کینسل کر دیں۔ میں ایک بہت اہم ڈنر پہ ہوں۔ (مسکرا کے اسے دیکھا۔ وہ بھی پلکیں جھپکا کے مسکرائی۔) اور اب آپ مجھے شک نہیں...“

الفاظ اس کے لیوں میں رہ گئے۔ دوسری طرف سے کچھ کہا جا رہا تھا۔

”واٹ؟ کیا ہوا ماہر کو؟“ اس کی رنگت فتح ہوئی۔ وہ دبادبا سا چلا یا۔

”کہاں ہے وہ؟“ رک کے سننا۔ ”ہاں ہاں میں پہنچ رہا ہوں۔“

تیزی سے فون رکھا اور جلدی جلدی والٹ کھو لئے گا۔ لڑکی نے تشویش سے اسے دیکھا۔

”ماہر کون؟“

”میرا بڑا بھائی۔“ اس نے چند نوٹ نکال کے میز پر رکھے۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

”بھائی؟“ سارا سحر چھن سے ٹوٹا۔

”تم نے کہا تم اکلوتے ہو۔“ اس کے ماتھے پہ بل پڑے۔

بیرون نوٹ رکھتے ہوئے اٹھا اور کچھ کہے سنے بغیر تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

”بیرون... تم مجھے یوں چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔ بیرون۔“ وہ اپنی جگہ پہ کھڑی دبی آواز میں غرائی تھی لیکن وہ دوڑتے قدموں سے باہر جا رہا تھا۔ ارگرد کے لوگ مرمر کے دیکھنے لگے تھے۔

وہ بگڑے تاثرات کے ساتھ واپس بیٹھی۔

سفید اور نیلی پلیٹ میں بچا ہوا ڈیزرت اس کو دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔ جس کی

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ کا ٹیکس تھا۔

یہاں سے ہمارا یہ اپارٹمنٹ بلڈنگز کی چھتیں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ ٹیرس پر ایک سادہ ساجھوار رکھا تھا جس کی لکڑی پہ فیری لائٹس لگی تھیں۔ جھولے پہ آرام دہ کشن رکھے تھے اور سامنے میز پہ لیپ ٹاپ اسکرین پہ نیٹ فلکس کا سرخ این رکا ہوا نظر آرہا تھا۔ ساتھ ہی کیریمل پاپ کارن کا بھرا ہوا پیالہ دھرا تھا جن سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ٹیرس پہ بنایہ چھوٹا مگر آرام دہ سائیٹ اپ و یک اینڈ کا اعلان کر رہا تھا۔

دفعتاً اندر وہی دروازے سے شبنم آتی دکھائی دی۔ پیروں میں کپڑے کے چیل پینے بالوں کو تو لیے کی گئی میں لپیٹے وہ نائٹ سوٹ میں مابوس تھی۔ ایک فخر یہ نظر اس نے اپنے جگمگا تھے ہوئے جھولے پہ ڈالی اور پھر سراٹھا کے سیاہ

آسمان کو دیکھا جہاں چند تارے دکھائی دے رہے تھے۔

”سارا ہفتہ مجھے اس رات کا انتظار رہتا ہے۔ بالآخر آج مجھے ماہر بے نامی بلا ٹنگ نہیں کرے گی۔“

وہ لاہور جا رہا تھا اور وہ یہ بھی وہ ویک اینڈ پر اس کو کم ہی ٹنگ کرتا تھا۔ وہ مسکرا کے جھولے پہ یوں بیٹھی کہ کشن میں ڈھنس سی گئی اور پیر میز پر رکھ لیے۔ پھر لیپ ٹاپ گود میں رکھا اور ایر فونز کا نوں میں گھسانے۔

”ڈھائی گھنٹے کی قرط دیکھنے کے لیے پاپ کارن بناتی ہوں اور وہ ڈھائی منٹ میں ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن خیر۔“ اس نے سر جھٹکا اور خوب سیٹ ہو کے بیٹھنے کے بعد اسکرین آن کی۔

جہاں سے سلسلہ پچھلے ویک اینڈ پر ٹوٹا تھا، وہاں سے جوڑا۔

ٹرٹوں... فون ایک دم سے چیخاتا تو ہاتھ سے پاپ کارن کے ٹکڑے دور جا گرے۔ شبم نے بد مزہ ہو کے موبائل اٹھایا۔

پیر بل کا ٹنگ۔

اس وقت؟ میں نہیں اٹھا رہی۔ جتنی مرضی کاں کر لے۔

موبائل سائیکلت کر کے اس نے واپس اسکرین کو دیکھا لیکن ارتکاز ٹوٹ چکا تھا۔

کاں پھر سے آنے لگی تو شبم نے ”اف اللہ میاں“ کہتے ہوئے فون جھپٹ کے اٹھایا۔

”نے پیر بل؟ نے؟ نے؟“ وہ زور سے غرائی۔ (کیا پیر بل؟ کیا؟ کیا؟)

دوسری طرف کہہ جانے والے الفاظ سن کے شبم کے چہرے کی بے زاری عنقا ہوئی اور دھیرے دھیرے اس کی رنگت بد لئے لگی۔ آنکھیں پھیل گئیں اور لب کھلے کے کھل رہے گئے۔

اگلے ہی لمحے اس نے تیزی سے ٹانگیں نیچے اتاریں، لیپ ٹاپ میز پر رکھا، جلدی سے پیر سلیپر زمیں گھسیڑے اور اٹھ کے اندر بھاگی۔

فیری لاٹھ سے سجا جھولا، کیریمل سے بچ پاپ کارن اور ساکن ہوئی اسکرین مایوسی سے اسے دور جاتے دیکھ رہے تھے۔



سریار پولیس اشیشن کے باہر جلتی بھتی تیوں والی کارز آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ پولیس اشیشن کئی منزلہ تھا اور اس کا ہر فلور مختلف جرائم کے لیے مختص تھا۔ ہومی سائیڈ فلور پر ایک بڑا سا ہال بنا تھا جس میں جگہ جگہ ڈیک لگے

تھے۔ کچھ لوگ فائل لیے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ کچھ کمپیوٹرز کے سامنے جھکے تھے۔ ایسے میں کونے میں ایک آفس تھا جس کے سلا یڈنگ ڈور کھلے تھے۔ باہر ”باش کومر“ (چیف انسپکٹر) کی تختی لگی تھی۔ اندر ایک بڑی میز کے پیچھے بر اجمن چنگیز فون کار بیسیور کان سے لگائے یوں بیٹھا تھا کہ بوٹ میز پر رکھے تھے۔ گریبان کے دو بُٹن کھلے تھے اور ہاتھ میں سگر بیٹ تھا۔ وہ بگڑتے تاثرات کے ساتھ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

کال ختم ہوئی تو اس نے ریسیور رکھا اور سگر بیٹ کی راکھ کوا ایش ٹرے میں جھٹکا۔ پھر کھلے دروازوں کے پار ہاں کمرے کو دیکھا جس کی ایک دیوار پر اونچا گھڑیاں نصب تھا۔

وقت کی سوئیاں دیکھ کے چنگیز نے بے زاری سے منہ پر ہاتھ رکھ کے جماں روکی۔ پھر ایک اسٹنٹ فائل لیے اندر آتا دکھائی دیا تو اس نے بوٹ نیچے اتارے۔

”باش کومر بے ایک بات پوچھوں؟“ اسٹنٹ نے فائل اس کے سامنے رکھ کے کھولی اور ساتھ ہی دانت نکال کے مخاطب کیا تو چنگیز سستی سے سیدھا ہوا اور قلم نکالا۔

”پوچھو۔“

”لوگ مرنے کے لیے ویک اینڈ کا انتخاب کیوں کرتے ہیں؟“ چنگیز نے اسی بے زاری سے سر جھٹکا۔

”کیونکہ استنبول والوں کے پاس سارا ہفتہ مرنے کے لے وقت نہیں ہوتا۔ ویک اینڈ پر وہ اپنی بورنگ زندگی سے فرار کے لیے یہ خوب الکھل پیتے ہیں۔ پھر کسی بار میں آپس میں لڑ پڑتے ہیں یا سڑکوں پر نکل جاتے ہیں۔ کوئی کسی گاڑی کے نیچے آ جاتا ہے اور کوئی غصے میں دوسرا کو مار دیتا ہے۔“

سائنس کر کے فائل پرے دھکیلی تو میز پر رکھا موبائل بجھنے لگا۔

”ابھی دیکھنا رات دو بجے کے بعد ایسے ایسے ایکسٹنٹ کیسز آنے لگیں گے جیسے بارش کے بعد کیڑے نکل آتے ہیں۔“ اکتا ہٹ سے کہتے ہوئے اس نے موبائل اٹھایا۔ نام پڑھ کے تیوریاں مزید چڑھ گئیں۔ فون کان سے لگاتے ہی وہ شروع ہو گیا۔

”بیربل میں تمہیں آخری دفعہ بتار ہا ہوں۔ میں تمہارے لیے کسی لڑکی کا بیک گرا اونڈ چیک نہیں کروار ہا۔ ہر ہفتے تم نئی لڑکی کا نام دے دیتے ہو۔ میں...“

اگلے الفاظ سن کے اس کی بولتی زبان رک گئی۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

”کون سا ہسپتال؟ میں آرہا ہوں۔“ چابی اور جیکٹ اٹھائے وہ تیزی سے میز کے پیچھے سے نکلا۔ سگر یٹ نیچے گر گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کا بوٹ سگر یٹ کے نکڑے کو رومند کے آگے بڑھ گیا۔

”کیا ہوا، کوم سارے؟“ اسٹمنٹ نے پیچھے سے پکارا۔

”میرے دوست کا ایک سینڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ تم لوگ پیچھے سے سنبھال لیما۔“ آواز لگاتا وہ دوڑتے قدموں سے لفت کی طرف جا رہا تھا۔

ڈیک پہ کام کرتے ایک آفیسر نے مژ کے اسے جاتے دیکھا۔ پھر افسوس سے سردا نہیں باٹھیں ہلایا۔

”ویک اینڈ نارت۔“

ساتھ بیٹھی لڑکی نے بھی بیچ کی آواز کے ساتھ شانے اچکائے۔ مژے سروال پس گھوم گئے اور سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔



سیلوں کے اس فیشل روم کی چھت تیز سفید بیوں سے روشن تھی۔ سفید بیڈ پر زارینہ لمبی لیٹی تھی۔ اس نے سیلوں کا گاؤں پہنا ہوا تھا اور ماتھے پر مخملیں بننڈ چڑھا کے بالوں کو چہرے پر آنے سے روک رکھا تھا۔ دونوں دائیں باٹھیں پھیلار کھے تھے اور دوڑ کیا۔ بہت مہارت سے ان کا مسانج کر رہی تھیں۔ خود وہ گردن پیچھے کو چھینکے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ سر کے پیچھے کھڑی ایک سفید کوٹ والی لڑکی اس کے چہرے پر سنہری پیٹ لگا رہی تھی۔

”ہوں.....“ ٹھنڈا پیٹ چہرے پر لگا تو زارینہ نے نزاکت سے سکاری بھری۔ ”یہ ٹھنڈا ہے۔“

”ہمارا ۲۳۱ کیرٹ گولڈ فیشل آپ کو اتنا پسند آئے گا کہ آپ بار بار آئیں گی۔“

”دیکھتے ہیں۔“ زارینہ نے بند آنکھوں سے شانے اچکائے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو سفید کوٹ والی لڑکی نے چونک کے اس طرف دیکھا۔

دروازہ کھلا۔ پھر ایک گردن نے اندر جھانکا۔

”زارینہ حامم کے لیے ریسیپشن پر کال آئی ہے۔“

زارینہ کی آنکھیں بند ہیں لیکن پیشانی شکن آسودہ ہو گئی۔

”اپنے اسٹاف کو سمجھا و میسا۔ کلانچٹ اپنا فون اس لیے آف کرتا ہے تاکہ سروہز کے دوران اس کو ڈسٹریب نہ کیا جائے۔“

سفید کوٹ والی لڑکی نے چوکھت والے لڑکے کو آنکھیں دکھائیں اور جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ ڈھنڈائی سے جما رہا۔

”کسی شبنم کی کال ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ ماہر بے کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔“

اس نے تیزی سے آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو کے بیٹھی۔ دونوں ہاتھ لڑکیوں کی گرفت سے کھینچ کے چھڑائے۔ لب شاک کے عالم میں کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور آنکھوں میں ایک دم بہت سے جذبات ابھر کے آئے۔

پھر سامنے آئینے پہ نگاہ پڑی تو چوکنی۔ دائیں گال پہ سنہرہ پیسٹ لگا تھا۔ بہت سا پیسٹ ابھی پیچھے کھڑی لڑکی کے پیالے میں تھا۔

”صاف کرو اس کو۔ جلدی۔“ وہ چلائی۔ بنا فیشل کے بھی اس کی رنگت گابی پڑ رہی تھی۔



یہ دو ہاکے ایک باندوبالا ہوٹل کی لابی تھی۔ رات کا وقت تھا اور زرد بیوں نے ماحول کو خوابناک بنار کھاتھا۔ ہوٹل کے داخلی دروازوں سے چار افراد اندر آتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سب سے آگے عبدالمالک فرید تھے۔ گرے سوٹ پینے، سفید براق بال جیل سے پیچھے کی طرف جمائے، ہمیشہ کی طرح بے تاثر چہرہ لیے۔ وہ ان تین افراد کے ہمراہ چلتے ہوئے لابی میں رکھے صوفوں کی طرف آئے۔ نظر اٹھا کے دیوار پر نصب گھڑیاں کو دیکھا۔

برڑی سوئی گیارہ سے ذرا پیچھے تھی۔ وہ وقت کی جمع تفریق کرتے ہوئے بڑے صوفے پہ بیٹھے اور ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔ چمکتے بوٹس میں فانوس کا عکس دکھائی دیتا تھا۔

”سر... مینگ میں بس پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔“ ساتھ کھڑا سوٹ والا نوجوان جھک کے پوچھنے لگا۔ ”آپ ڈنر ہاں میں انتظار کرنا چاہیں گے؟“

”میں اسی وقت پہ ہاں میں جاؤں گا جو طے ہوا تھا۔“ وہ آرام سے بیٹھے رہے۔ انگلیاں صوفے کے ہتھ پہ عادتاً چل رہی تھیں جیسے نادیدہ پیانا بجارتی ہوں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی تھی جس میں سفید پتھر جڑا تھا۔

اسی پل ہوٹل کے داخلی دروازے سے کوئی بھاگتا ہوا اندر آتا دکھائی دیا۔ اس نے شوفر کا یونیفارم پہن رکھا تھا اور سانس پھولا ہوا تھا۔ پہلے اس نے متلاشی نظرؤں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جیسے ہی نگاہ لابی میں بیٹھے مالک پر پڑی وہ تیزی سے ان کی طرف پکا۔

”سر... سر...“ ان کے سر پر پہنچ کے ہانپتے ہوئے کہے گیا۔

”آپ کافون آف تھا۔ زارینہ میڈم نے مجھے کال کی ہے۔“

مالک نے گردن اٹھا کے ایک خشیگیں نظر اس پر ڈالی اور دوسری گھڑیاں پا۔

”میری میٹنگ میں تین منٹ رہتے ہیں۔ جلدی بولو۔“

”سرودہ...“ وہ ہکایا۔ رک کے سانس لیا۔

”ماہر کا ایکسٹرمنٹ ہو گیا ہے۔ اس کو ایمر جنسی میں ہسپتال لے گئے ہیں۔“

صوفے کے ہتھ پہ نادیدہ پیانا نوجاتی انگلیاں ہکم گئیں۔ چند لمحے کے لیے مالک فرید بنا پلک جھپکے اس کو دیکھے گئے۔

”کہاں؟“ الفاظ دھیرے سے نکلے۔

”استنبول۔ اس کے گھر کے سامنے۔ hit and run۔“

عبدالمالک خاموشی سے اپنے چمکتے جوتے کو دیکھنے لگے جو ٹانگ پٹانگ جمانے کے باعث اوپر اٹھا ہوا تھا۔ ان کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔

”سر میں میٹنگ کینسل کر دیتا ہوں۔“ سیکرٹری پریشانی سے کہتا جگہ سے اٹھا۔ اور مجموعہ الغرداں کے نمائندے سے کہہ دیتا ہوں کہ ہم چند دن بعد میٹنگ رکھ لیں گے۔“

وہ خاموشی سے اپنے بوٹ کو دیکھے گئے۔

سیکرٹری اب مو بالل روشن کر کے کچھ دیکھ رہا تھا۔

”دو ہا سے استنبول کے لیے پہلی فلاٹ رات گیا رہ بجے نکلے گی۔ سیٹ بک کرو ادوس؟“

”دنیں۔“ ان کا لہجہ تھنڈا تھا۔ سیکرٹری رک کے انہیں دیکھنے لگا۔

”سر، میٹنگ کے ساتھ ڈنر بھی ہے۔ تین گھنٹے لگ جائیں گے۔ فلاٹ مس ہو گئی تو اگلی فلاٹ کل دو پھر کی ہو گی اور....“

”تم نے وہ کتاب پڑھی ہے Rich Dad, Poor Dad، وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے اٹھے اور سیکرٹری کو بغور یکھا۔ اس کا سرنگی میں ہل گیا۔

”جانتا تھا۔ اسی لیے تم ساری عمر ایک سیکرٹری رہو گے، عمار۔ کیونکہ تمہارے پاس میرے بھائی جیسا کوئی باپ نہیں تھا جو تمہیں یہ سمجھاتا کہ الفرداں گروپ کے ساتھ مہینوں پہلے طے کی گئی میٹنگ کینسل کرنا حماقت سے کم نہیں ہوتا۔“

”لیکن سر.. ماہر ہسپتال میں ہے....“

”اگر میں نے یہ میٹنگ چھوڑی تو ماہر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ہم کل دو پھر کی فلاٹ لے لیں گے۔“ وہ دو قدم آگے بڑھے۔ پھر ہاتھ صوف کی پشت پر رکھا۔ جیسے چکر سا آیا ہوا اور بر وقت سہارا لیا ہوا۔ لمبھر کے لیے کرب سے آنکھیں بند کیں اور گہری سانس اندر رکھنچی۔

پھر آنکھیں کھولیں تو چہرہ واپس رو بوٹ بن چکا تھا۔ البتہ ہاتھوں میں معمولی سی کپکپا ہٹ تھی۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ اور سیکرٹری ہکابکا سا چیچے بھاگا۔

شوفر ملائمی نظروں سے ان کو جانتے دیکھتا رہا۔
ایسی بھی کیا پیسے سے محبت۔ ہونہے۔



مبین منزل کی بالائی منزل پہ بنے اسٹوڈیو میں پرانے پینٹ اور رونگن کی مدھم خوشبو پھیلی تھی۔ شیلف میں اوپر تلے رکھے خالی ڈبے، اور دیواروں پہ چپاں کاغذ خاموشی سے ان دونوں بہنوں کو دیکھ رہے تھے جو وسط کمرے میں موجود تھیں۔

مالاز میں پہ بیٹھی، گردن اٹھائے ماہی کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے بے یقین سی کھڑی تھی۔

”تم اس کو پہچانتی ہو؟“

ماہی نے سفید بالوں والے آدمی کے چہرے سے نظریں ہٹا کے ملا کو دیکھا۔

”سو فیصد۔ تمہیں نہیں یاد؟“

”نہیں۔ کون ہے یہ؟“ وہ تیزی سے اٹھی یہاں تک کہ وہ اس کے برادر کھڑی ہو گئی اور بے چین نظروں سے اس

کا چہرہ ٹولा۔

”یہ شکور ہے۔ ہمارے اسکوں کا چڑھا ستی۔“

”وات؟ ناممکن۔“ وہ بدک کے پیچھے ہٹی۔ پھر تیزی سے کاغذ کھینچا اور غور سے اسکچ کو دیکھا۔

”ارے ہاں۔ یہ تو شکور ہے۔“ اس نے تعجب سے چہرہ اٹھایا۔ ”یہ عامل نہیں ہو سکتا۔“

”شاید بن گیا ہو۔ انسان کس وقت کس راستے پہ چل نکلے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔“

مالا لب کا ٹھٹھے ہوئے اس چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن کے پردے پہ ایک دم بہت سے پرانے دن لہر انے لگے۔ وہ سارے دن جو یادداشت کے صندوق میں محفوظ کر کے ایسے پکے تالے لگائے تھے کہ کبھی کھل نہ سکیں۔ اور اب ایک زور دار آواز کے ساتھ پہلاتا لاچھٹا تھا۔

”لیکن شکور تمہیں نقصان کیوں پہنچانا چاہے گا؟“ ماہی کی سوچ میں ابھری آواز گونجی تو وہ چونکی۔ شانے اچکا دیے۔

”ایک وجہ ہے اس کے پاس۔“ وہ بڑ بڑا تی۔ ماہی نے چونک کے اسے دیکھا۔ اس کی رنگت سفید ہو رہی تھی۔

”کیسی وجہ؟ ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتی؟“ اس نے مala کے چہرے کو کھو جتنی نظر دوں سے دیکھا لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ بس کاغذ تہہ کرنے لگی۔ دو ہر اکر کے تہہ لگائی۔ پھر دوسرا تہہ۔

”تم پراسرار ہوتی جا رہی ہو ملا۔ تم نے مجھے وہ راز بھی نہیں بتایا جو تمہیں ماں کی ڈیتھ پہ معلوم ہوا تھا، اور جس کے باعث تم اتنی پر سکون تھیں۔“

وہ کاغذ کو ایک کے بعد ایک کے تہہ لگا رہی تھی۔ اب وہ موٹا ہوتا جا رہا تھا سو اسے موڑنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

”اب ہم شکور کو کیسے ڈھونڈیں گے؟“ ماہی کھنکھاری۔

مالا غائب دماغی سے کاغذ کو دو ہر اکر کا تھا تو وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا کہا تم نے؟“

”تم ایک کاغذ کو سات دفعہ سے زیادہ فولڈ نہیں کر سکتیں۔“

کشممالہ نہیں نے گھری سانس لے کر شانے اچکائے۔

”وولدز ریکارڈ ۱۲۰۰ دفعہ کا ہے۔“

اور وہ دونوں دھیرے سے بنس دیں۔ ماحول میں چھائی سو گوار بیت کم ہوئی۔

”شکور عامل ہو گا لیکن وہ کسی کائنٹ کے کہنے پر ہمارے اوپر عمل کر رہا تھا۔ اس کا کائنٹ کون ہو سکتا ہے؟“ ماہی نے گال پر انگلی رکھی۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ ”یقیناً کبیرہ تائی۔“

”ہم نے کبیرہ تائی کا کیا بگاڑا ہے؟“ مala افسوس سے دیوار پر لگے کاغذوں کو دیکھ رہی تھی۔

”ماں اور میں نے ان کا بہت کچھ بگاڑا ہے۔ اسی لیے میری بیٹی کے پیچھے پڑی تھیں۔ ہمارے اوپر جادو کروانے والے عموماً قربتی رشتے دار ہی نکلتے ہیں۔“ پھر وہ چونکی۔ جیسے کچھ یاد آیا۔

”ماہر کا قربتی پچا...“ گڑ بڑا کے تصحیح کی۔ ”ماہر فرید کا پچا جس نے اوشن خریدا تھا...“

”اسی کے کہنے پر خریدا ہو گا۔“ تلخی سے بڑ بڑا تی۔

”اس نے تمہیں کال کی تھی لیکن خود ملنے نہیں آیا تھا۔ اپنے بھتیجے کو تھیج دیا۔ وہ تمہارا سامنا کرنے سے احتراز کیوں کر رہا تھا؟“

”معلوم نہیں۔“ کشمائلہ نے لاعلمی سے شانے اچکائے۔ ”یقیناً وہ اوشن آتا رہتا ہو گا۔ میرا اور اس کا سامنا ہوا ہو گا۔ اور وہ دوبارہ نہیں ملنا چاہتا ہو گا۔“

”کیا تمہیں اس سے ملاقات یاد ہے؟“

”نہیں۔ شاید اس نے اپنا نام نہ بتایا ہو۔“

”ہو سکتا ہے اس نے ماہر فرید کو بتائے بغیر...“

”میں اس کو یا اس کے خاندان کو ڈسکس نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ ایک دم بے زار ہوئی۔ ”اور تمہیں میں نے منع کیا تھا۔ اس کے خاندان کو انٹر نیٹ پر اسٹالک مت کرنا۔ دور رہو میرے مسئللوں سے۔“

اس کے بدلتے تیور دیکھ کے ماہی نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماہی لاکھ منہ پھٹ سہی وہ اس کی بڑی بہن تھی۔

پل بھر کے لیے اسٹوڈیو میں غیر آرام دہ سی خاموشی چھاگئی۔ پھر ماہ بینہ کھنکھاری۔

”نگینہ آنٹی اس روز بتا رہی تھیں کہ اگلے ہفتے زیاد آئے گا۔ تعزیت کے لیے... اور اپنی منگنی کے لیے...“

”معلوم ہے۔ تمہاری بھی اس سے ملاقات ہو جائے گی۔“ مala پلٹ کے تہہ شدہ کاغذ کو ایک فولڈر میں ڈالنے لگی۔

”میں زیاد سے مل چکی ہوں۔“

”کب؟“

مالا نے تعجب سے پٹ کے اسے دیکھا۔

”سہیل کی شادی پر۔ ہم دونوں اس سے ملے تھے۔ یا نہیں؟“

”تب میں اوشن کی مینیجر تھی۔ میرا دماغ کام میں اتنا مصروف ہوتا تھا کہ یادداشتیں نہیں بنتی تھیں۔“ کشمالة نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔ اس میں تلخی بھی تھی اور ماضی کا ناسٹیل جیا بھی۔

”جس دن میں نے کیف کونو کری دی تھی، اسی روز مجھے اوشن سے نکالا گیا تھا (پھر سے ٹھنڈی سانس) اور اس رات زیادا اور گنیز آٹھ اسلام آباد آئے تھے۔“ کچھ یاد کر کے وہ مسکرائی۔ ”اور وہ ہر اونیز لائے تھے۔ ممانی نے میرا حصہ نکال کے اوپر بچوں ادا یا تھا۔“

ایک منظر ہن کے پر دے پڑا۔

گیلے ٹیرس پر کھڑی براؤنی کھاتی لڑکی اور نیچے پورچ میں کھڑا زیاد سلطان جس نے سراٹھا کے اوپر دیکھا تھا۔

”کیا تم اس کی منگنی پر افسرد ہو؟“ ماہی نے غور سے اس کی مسکراہٹ کو موبہوم ہوتے دیکھا۔

”میں بس اس عامل کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔ اور اس سے اپنی ماں کو دی گئی ہر تکالیف کا حساب لینا چاہتی ہوں۔“ وہ فولڈر میں رکھے کاغذات کو ترتیب دے رہی تھی۔

ماہی خاموش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کشمالة اپنے گرد کھینچی اور نیچے دیواروں کو اتنی جلدی نیچے نہیں کرتی۔ وہ اس وقت نہ زیاد سلطان کی بات کرنا چاہتی تھی، اور نہ ہی اس انسان کی جسے وہ کیف کہتی تھی۔

(ویسے وہ کہاں رہ گیا؟ دو دن پہلے کہہ رہا تھا کہ تعزیت کرنے ہمارے گھر آئے گا۔) وہ سیرھیاں نیچے اترتے ہوئے فون پر ماہر کی چیخت دیکھ رہی تھی۔ اس کی جانب خاموشی چھائی تھی۔ نہ کوئی پیغام۔ نہ کال۔

(کم بخت۔) وہ خفگی سے بڑا بڑا کے آگے بڑھ گئی۔



ہستال کی راہداری سرداور سفید تھی اور اس میں کسی disinfectant کی بوچھیلی تھی۔ ایک سائینڈ پر رکھے پھر پر وہ چند افراد بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ زارینہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی، اضطرابی کیفیت میں لمبے بالوں کو مسلسل انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ قریبی نیچے شبنم بیٹھی تھی۔ آج اس کے سر پر اسکارف تھا اور وہ دونوں ہاتھ باہم پھنسائے زیر لب

کچھ بڑا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی پنڈولم کی طرح سامنے دائیں سے بائیں ٹھلتے ہیر بل پہ جمی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ سر پر کھے، سفید پڑے چہرے کے ساتھ کبھی ایک کونے میں جاتا کبھی دوسرے میں۔

”بیر بل بیٹھ جاؤ۔ تم مجھے اری ثیث کر رہے ہو۔“ زارینہ نے ٹانگ سے ٹانگ سے ٹانگ ہٹا کے جوتا زمین پر زور سے رکھا تو وہ رکا۔ چند لمحے ضبط سے اسے گھوٹا رہا، پھر شبنم کے دوسرا جانب دھپ سے آکے بیٹھا۔

”تم کہاں سے تھوڑے؟“

سوال پر اس نے چونک کے شبنم دیکھا۔ وہ دعا روک کے اس کے نئے سوٹ کو مشکوک نظرؤں سے دیکھ رہی تھی۔

”ایک ورک میٹنگ میں تھا۔“

”ورک میٹنگ نے کس رنگ کی لپ اسٹک اگار کھی تھی؟“ اس نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔ اس نے جواباً تیز نظرؤں سے شبنم کو گھورا۔

”کم از کم میری کوئی لاکف تو ہے۔ تمہاری طرح ویک اینڈ پر نیٹ فلکس کے ساتھ پاپ کارن نہیں کھاتا۔ یہی کر رہی ہو گی ناتم اس وقت؟“ شبنم کا چہرہ سرخ ہوا۔ ہونہہ کہہ کے رخ اس کی طرف سے موڑ کے دوبارہ سے ہاتھ جوڑ لیے اور زیر لب کچھ پڑھنے لگی۔

تیز قدموں کی آواز پر بیر بل جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے سے چنگیز چلتا آرہا تھا۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ وہ قریباً دوڑ کے اس کی طرف لپکا۔

”سی تی ٹی وی فوٹج کے مطابق حملہ آور الیس یووی اس کے انتظار میں رکی کھڑی تھی۔ اس کو سڑک کر اس کرتے دیکھ کے آگے بڑھی اور نکل کر مار کے نکل گئی۔“

”یعنی یہ سراسر قاتلانہ حملہ تھا؟“ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔ چنگیز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اس کی نمبر پلیٹ غائب تھی اور چند گلیوں کے بعد وہ ایک ایسی اسٹریٹ میں مڑ گئی ہے جہاں کیرے نہیں تھے اور وہیں سے اس کا سراغ کھو گیا ہے۔ لیکن فکر مت کرو۔ ہم اس کو تلاش کر لیں گے۔“ اس نے دھیرے سے بیر بل کا کندھا تھپکا۔

”کوئی ماہر کو کیوں مارنا چاہتا ہے؟“ اس نے کندھا لہکا سا پچھے کیا۔ اس کا دبلا پتلا کندھا چنگیز کے بھاری ہاتھ کی گرفت میں دبو چاہوا محسوس ہوتا تھا۔

”ماہر کے اندر ایک مقناطیس لگا ہے جو مصیبت کو اپنی جانب سمجھتا ہے میرے دوست۔“ چنگیز کے چہرے پر افسوس بھی تھا اور تنکان بھی۔ پھر اس نے بند دروازوں کی طرف دیکھا۔

”ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں؟“

”سر جری ہو رہی ہے۔ اس کی بائیں ٹانگ بری طرح متاثر ہوئی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں گلابی سی نبی ابھری۔

”وہ تھیک ہو جائے گا۔ ماہر بہت سخت جان ہے۔“

”اس کا ایک دفعہ پہلے بھی بائیک ایکسٹرٹ ہوا تھا۔ تب اس کی رائٹ ٹانگ زخمی ہوئی تھی۔“

”رائٹ نہیں لیفٹ۔“ زارانے اسے گھورا۔ ”تب بھی اس کی لیفٹ ٹانگ ہی زخمی ہوئی تھی۔“

”اوہ۔“ پیر بل کے لبوں سے ایک طویل اوہ خارج ہوئی۔

چنگیز نے ایک گھری نظر تھا پر بے زار سی بیٹھی زارینہ پر ڈالی، پھر اسے کہنی سے تھام کے ذرا فاصلے پر لے گیا۔

”یا سی سفید بالوں والے مشکوک آدمی کی بیٹی ہے نا؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”وہ مشکوک آدمی نہیں، میرا پچھا بے۔“ وہ بر امان گیا تھا۔ ”وہ ماہر سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ بھی ماہر کون فضان نہیں پہنچائے گا۔“

”اور کہاں ہے وہ اس وقت؟“ چنگیز نے معنی خیز انداز میں ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے تلاش کر رہا ہو۔

پیر بل ایک لمحے کو چپ ہوا۔ ”زارا کہہ رہی تھی اس کی کوئی بہت اہم میٹنگ تھی۔ ویسے بھی ہم سب یہاں ہیں۔ اس نے آکے کیا کر لینا تھا؟“

شبہم مشکوک نظر وہیں سے ان دونوں کو دور کھڑے سرگوشی میں با تین کرتے دیکھ رہی تھی۔

”ایسے ویسے تمہارے چچا کا ایک پیر جہاز میں ہوتا ہے۔ کبھی اندن تو کبھی استنبول۔ لیکن آج ویک اینڈ نائنٹ پر وہ مصروف تھا۔ اللہ اللہ۔“ چنگیز نے دونوں ہاتھا اٹھادیے۔

”مالک کبھی ماہر کو ہرٹ نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ اس سے با تین چھپا سکتا ہے۔ وہ اس کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک رو بوٹ ہے۔ نہ کہ کوئی ولن۔“

اس کا انداز اتنا یقینی تھا کہ چنگیز ایک گھری سانس بھر کے رہ گیا۔

”تم بہتر جانتے ہو گے۔ تمام۔“

”تم لوگ آپس میں کیا بات کر رہے ہو؟“ شبہم کی آواز پر وہ دونوں چونک کے پلٹے۔

”تمہیں ڈسکس کر رہے تھے۔ تم آگئی ہو اس لیے چپ کر گئے ہیں۔“ بیربل جل کے بولا۔ شبنم نے خفگی سے اسے دیکھا۔ پھر ہتھیلی پھیلا کے چنگیز کے سامنے کی۔

”ماہر بے کافون کہاں ہے؟“

”اوہ ہاں۔ یہ رہا۔“ چنگیز نے ماتھے کو چھوا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے جیکٹ کی جیب سے ایک زپ لاک بیگ نکال کے اس کی طرف بڑھایا جس کے اندر ایک ٹوٹی اسکرین والا موبائل تھا۔

”یہ تباہ ہو چکا ہے۔“

”اپل کے فون اتنی جلدی تباہ نہیں ہوتے۔ صرف اسکرین ٹوٹی ہے۔“ شبنم فون کو نکال کے الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

ذرادیر بعد اسکرین روشن ہو گئی تو وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا دی۔ ”اپل فار لاکف۔“ جگمگاتی اسکرین ان کو دکھائی۔

”کیا کسی کو ماہر کا پاس لوڈ معلوم ہے؟“

”نہیں لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟ ہم صب قریبی لوگوں کو اطلاع کر جکے ہیں۔“

”اوہ وہ باغبان کی بیٹی؟“

بیربل جہاں تھا، وہیں رہ گیا۔ اسے تو وہ بھول ہی گیا تھا۔

”تمہیں اسے بتانا چاہیے۔“ چنگیز تیزی سے بولا۔ ”وہ یہاں آجائے گی اور شاید دونوں کے سارے منسلک ہو جائیں۔“

”لیکن میرے پاس اس کا نمبر نہیں ہے۔ میں اسے کیسے اطلاع کروں؟“ پھر کچھ سوچ کے اس نے لنگی میں سر ہلا دیا۔

”میرا نہیں خیال وہ ماہر کے لیے اتنی دور استنبول آنا چاہے گی۔“

☆☆☆☆☆☆☆

”تم استنبول جانا چاہتی ہو؟“

مالا کمرے میں آئی تو خالی بیڈ اس کا منتظر تھا۔ چادر بے شکن تھی۔ اور دو ایسا سائیڈ ٹیبل سے ہٹا دی گئی تھیں۔ وہ چپ چاپ بیڈ کے کنارے پہ بیٹھی اور چادر پہ ہاتھ پھیرا۔

”ماں کے ہوتے ہوئے اس کمرے میں کچھ مختلف ساتھا۔“ معید چوکھت میں آ کھڑا ہوا۔ وہ بھی وہی دیکھ رہا تھا جو اس کی نظروں میں تھا۔

”وہ ماں کی رونق تھی۔ بڑوں کی اپنی رونق ہوتی ہے۔“ وہ سر جھکائے انگلیاں چادر پہ پھیرتے ہوئے کچھ محسوس کر رہی تھی۔ ”ہر کونے سے ان کی آواز آتی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلوتی ہوں تو لگتا ہے وہ سامنے بیٹھ پہ بیٹھی ہوں گی۔ نالگیں نیچے لٹکائے، گود میں دواؤں کا باکس رکھئے سر جھکائے الجھی سی کچھ تلاش کر رہی ہوں گی۔“

”ہم اپنی ماڈ کاموں میں پھنسا، الجھا الجھا سا ہی دیکھتے ہیں۔ جب ان کی خدمت کروا نے کی عمر آتی ہے تو وہ چلی جاتی ہیں۔“ وہ چوکھت سے سر لٹکائے اداں نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر پھیلی تاریک رات ان کو اسی ادا سی سے دیکھ رہی تھی۔

”کیسے نکلیں گے ہم اس فیر سے؟“ مالانے پر امید نظروں سے اسے دیکھا۔

”کمرے کی سینگ بدل دو۔“

پھر وہ کھنکھارا۔ جیسے ہمت مجتمع کی ہو۔

”تم اتنی بول جانا چاہتی ہو؟“

مالانے چونک کے اسے دیکھا۔ آنکھیں اچھبے سے اکٹھی ہوئیں۔

”میں کئی دفعہ اتنی بول جا چکی ہوں۔ لیکن تم اس حالت میں Vacation کا سوچ رہے ہو؟“ اسے جیسے بر الگ تھا۔

”نہیں۔ میں اتنی بول منتقل ہونے کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے ترکی میں ایک فیلو شپ کرنی ہے۔ ماں کی وجہ سے ہر سال چھوڑتا رہا۔ اب جاسکتا ہوں لیکن تمہیں چھوڑ کے نہیں۔ تم ساتھ چلنے کی ہامی بھرو تو میں اپلائی کروں گا۔“

”تم ماں کے غم سے فرار چاہتے ہو؟ حالانکہ اس غم سے کبھی فرانہیں ملتا۔“

”میں بس لا ہوں میں نہیں رہنا چاہتا۔“

”لیکن مجھے ابھی یہاں رہنا ہے۔ چند کام ہیں جو مجھے کرنے ہیں۔“ وہ بولی تو چہرہ ایک دم سپاٹ ہو گیا۔ کچھ تنخ ساتھا جو کمرے کی خاموشی میں گھلتا چلا گیا۔

”سوچ لو۔ یہاں رہ کے صرف تم اپنی مینٹل ہیلتھ خراب کرو گی۔“ وہ نرمی سے زور دیتے ہوئے پلٹ گیا۔ پھر کچھ یاد آنے پہ واپس پلٹا۔

”کیف کافون آیا تھا جنازے والے دن۔ تعزیت کے لئے۔“

وہ ایک دم چوکی۔ دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ بہن بھائی آج کل ایک دوسرے کو بتاتے رہتے تھے کہ فلاں کافون آیا، یا فلاں کا نہیں آیا۔ کس نے جنازے میں شرکت کی، کس نے نہیں کی۔ ہر پاکستانی گھرانے کی طرح ان کو بھی ہر اس شخص کو یا درکھنا تھا جو ان کے برے وقت میں ساتھ تھا۔ اور جس نے پلٹ کے پوچھا بھی نہیں۔

معید اطلاع دے کر آگے بڑھ گیا اور وہ جہاں تھی وہی بیٹھی رہ گئی۔

”وہ معید کو کال کر سکتا تھا تو ایک کال مجھے بھی کر سکتا تھا۔ لیکن نہیں۔ نہ کال کی۔ نہ خود آیا۔“ وہ خود سے بڑھ دار ہی تھی۔ آنکھیں بھیکنے لگیں۔ کچھ تھا جو بہت بر الگ تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین ساتھا کروہ آئے گا۔ کال نہیں کرے گا لیکن ایک دن وہ اچانک سے ڈور بیل بنجنے پہ دروازہ کھولے گی تو وہ سامنے کھڑا ہو گا۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کیف کے بارے میں غلط تھی۔

ایک دم تیز پانی کے گرنے کی آواز نے اس کا رنگ توزا۔ مالانے چونک کے با تھروم کی سمت دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا پھر؟

وہ دھیرے سے اٹھی اور قدم قدم چلتی با تھروم تک آئی۔ نیم واد روازہ پورا دھکیا۔ سنک کا نل کھلا تھا اور پانی تیز دھار سے نیچے گر رہا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور سختی سے نل بند کیا۔ پھر پلٹی ہی تھی کہ ٹوٹی کے گھونمنے کی آواز آئی اور نل دوبارہ چل پڑا۔

ایک گھری سانس لے کر کشمالة میں واپس پلٹی۔ چہرے پہ نہ کوئی خوف تھا، نہ کوئی پریشانی تھی۔

”تمہیں لگتا ہے تم مجھے ڈر سکتے ہو؟ وہ بھی پانی کے ایک نل سے؟ ہونہہ۔“ وہ آگے بڑھی اور ٹوٹی زور سے گھمانی لیکن مخالف سمت۔ ایسے کنل پورا کھل گیا۔ پانی کی دھار مزید تیز ہو گئی۔

”لو۔ کھل گیا نل۔ مزید کیا کرنا ہے؟ میرے گھر کے شیشے توڑنے ہیں؟ توڑو نا۔ توڑو۔“ وہ دائیں بائیں خالی با تھروم میں دیکھتے ہوئے زور سے غرائی۔

”کیا کر سکتے ہو تم؟ مجھے ڈرانا چاہتے ہو؟ ڈراؤ نا۔ آؤ۔ پھر سے پکڑو میری گردن۔“ اوہ اطراف میں دیکھتے ہوئے گول گول ایڑیوں پہ گھوم رہی تھی۔

”تم ایک بے وقوف اور ڈر پوک مخلوق ہو۔ میں نہیں ڈرتی تم سے۔ وہ عامل جس کے تم غلام ہو اور جس کے کہنے پر تم نے میری ماں کو اذیت دی تھی، جا کے اس کو میرا ایک پیغام دینا۔“ اس کی غراہٹ بلند ہو رہی تھی۔

”اے وہ کہنا وہ تیار رہے۔ مجھے اس کا چہرہ معلوم ہے۔ اور میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ وہ جسے آج تک کوئی نہیں ڈھونڈ سکا، اسے میں ڈھونڈوں گی۔“ چہرہ گلبی ہو کے تمتمار ہاتھا۔ ایک جھٹکے سے ٹل بند کیا اور دھاڑ سے باٹھ روم کا دروازہ مارتی وہ کمرے میں واپس آئی۔

نل دوبارہ نہیں کھلا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ کوئی آہٹ نہیں۔ کوئی چاپ نہیں۔

”بزدل۔“ وہ بستر پہ بیٹھی تو چھن سے ایک منظر آنکھوں کے سامنے آیا۔

وہ دنوں کافی شاپ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بھوری آنکھوں والا مرد اسے اپنی کہانی سنارہتا اور وہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اس کا نام سرکار ہے۔ یعنی اس کے کائنٹس اسے سرکار کے نام سے جانتے ہیں۔ میرا سوتیلا باپ اس کا کائنٹ تھا۔ لیکن وہ بھی اس کی اصل شناخت سے واقف نہیں تھا۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک بوڑھا جادوگر ہے۔ اس کے بال سفید اور رنگت سیاہی مائل ہے۔ اور وہ سر پہ ایک نارنجی رومال پیشتا ہے۔ اس نے بہت سے خاندان توڑے ہیں۔ بہت لوگوں کو واذیت دی ہے۔ لیکن اسے آج تک کوئی نہیں ڈھونڈ سکا۔ میں بھی نہیں۔“

کافی شاپ میں بیٹھی لڑکی اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

لیکن اس وقت اپنے بیٹہ پہ بیٹھی لڑکی کی آنکھوں میں شک نہیں تھا۔ صرف چھپن تھی۔

”کیا وہ بچ کہہ رہا تھا؟ کیا وہ خود اس عامل کا کائنٹ نہیں تھا؟ کیا وہ خود الہم میں موجود لڑکیوں پہ ظلم کرنے والا نہیں تھا؟“ اس نے سر جھکا۔ ”شاید وہ بچ کہہ رہا ہو لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا۔ کئی ماہ مجھ سے جھوٹ بولا۔ میرا ریستوران چھینا۔ اپنے اور سرکار کے کھیل میں مجھے کیوں شامل کیا؟ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، کیف۔“

پھر اطراف میں دیکھا۔ اس کا کمرہ خالی تھا لیکن وہ جانتی تھی سرکار نامی اس عامل کے چیلے اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

”وہ جسے کوئی نہیں ڈھونڈ سکا، اسے میں ڈھونڈوں گی۔“ وہ لیٹ گئی اور ماتھے پہ بازو رکھ کے آنکھیں موند لیں۔

وہ اب خوفزدہ نہیں تھی۔ اس کی ماں چلی گئی تھی۔ اب کھونے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

بصارت اندر ہیر ہوئی تو ایک منظر ہن کے پردے پہ چلنے لگا۔

اندر کمرے میں ماں کی میت رکھی تھی اور وہ نائٹ سوٹ میں ملبوس کچن کاؤنٹ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے

سامنے کٹے ہوئے بالوں والی مسکراتی ہوئی ڈاکٹر سلیمہ کھڑی تھیں۔ ان کے لب دھیرے دھیرے بل رہے تھے۔

”کیا میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں جو ان بچوں کو معلوم ہوتا ہے جن کے ماں باپ ان کے سامنے مر جاتے ہیں؟“

”میرے والد کی ڈیتھ اس وقت ہوئی جب میں بہت چھوٹی تھی، سلیمہ آئٹی۔ تب تو مجھے ایسا کوئی راز معلوم نہیں ہوا۔“

کچن کا ونڈر کا منظر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ایک آنسو آنکھ سے نکلا اور گردن پڑھلتا چلا گیا۔ اس آنسو کا رنگ شفاف پانی جیسا تھا۔ اور اس شفاف پانی میں دھنک کے ساتوں رنگ مقید تھے۔

ان رنگوں کے اندر ایک اور منظر جنم لینے لگا۔

عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم.... وسط صحن میں رکھی چار پائی... اجلے سفید کفن میں لپٹا ایک بند آنکھوں والا مردانہ چہرہ۔ چار پائی کی پائٹی کے ساتھ بیٹھی ایک فربہ ہی لڑکی جس کی آنکھیں سبز تھیں اور کلاسیوں میں سونے کے لکنکن تھے۔ وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں روئے جا رہی تھی....

صحن کے دوسرے کونے پر وہ کھڑی تھی۔ ایک چھوٹی سی سبز آنکھوں والی لڑکی جس نے بالوں کی اوپنچی پونی بنا رکھی تھی۔ اس کے کندھے کے ساتھ ایک لڑکا کھڑا تھا جو قد میں اس سے چند اچھے چھوٹا تھا۔ ساتھ پچھی چار پائی پر ایک اور نہیں لڑکی سورہی تھی جو کافی صحت مندا اور بھرے بھرے گالوں والی تھی۔

”تم بڑی ہو، کشمائلہ۔“ ایک بوڑھی خاتون جو اس چار پائی پر پیر لکھائے بیٹھی تھیں، اس کا ہاتھ تھام کے محبت سے کہنے لگیں۔

”بڑی؟“ وہ جو بھیگی آنکھوں سے دور صحن میں رکھی میرت کو دیکھ رہی تھی، چونکے انہیں دیکھنے لگی۔

”ہا۔ تم بڑی ہو اور یہ چھوٹی۔ بڑا بھن بھائی باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ اب یہ دونوں نہ صرف تمہاری ماں بلکہ تمہاری بھی ذمہ داری ہیں۔“

اس نے نسبتی سے سر ہلا دیا اور آنکھ سے نکلا آنسو ہتھیلی کی پشت سے رگڑ دیا۔

”دیکھو بیٹا... اب تمہارا باپ نہیں رہا۔ اب تم لوگوں کو قدم پھونک پھونک کے رکھنا ہو گا۔“ کسی دوسری خاتون نے سر گوشی کی۔ وہ چونکے ان کو دیکھنے لگی۔

”اب تم لوگ اپنے کمزور سے کبھی مت لڑنا۔ بالخصوص اپنے ماموؤں اور ان کے بچوں سے بنائے رکھنا۔ پہلے

مبین تمہارے سر پر تھا۔ اب وہ نہیں ہے۔ اسی لیے نہ دھیال میں کسی کوشکایت کا موقع دینا ہے نہ خیال میں۔“
”ہاں بیٹا۔ تم نے اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا ہے۔ اپنے خاندان کے ساتھ جڑے رہو گے تو سب ٹھیک رہے گا۔ کسی سے نہیں لڑنا۔“

”کسی سے نہیں لڑنا۔“ اس نے زیر لب دھرا یا۔

کشمائل نے آنکھیں کھولیں۔ ایک اور آنسو گال سے لڑھک کے نیچے جا گرا۔

چار سدہ کا صحمن غائب ہو گیا۔ وہ لا ہور میں اپنے کمرے میں لیٹھی تھی۔ اس کے اور اس کی کم علم، اور تنگ ذہن رشتہ دار خواتین کے درمیان بہت سے فاصلے تھے۔ کئی برس کی تعلیم، اور ایک طویل عرصے تک ورگنگ و دمن ہونے کا فاصلہ۔ ہائی سوسائٹی کے exposure اور دنیا گھومنے کا فاصلہ۔ وہ ان سے بہت دور جا چکی تھی۔

لیکن کیا واقعی؟

کیا واقعی کچھی عمر میں ذہن پہ لگی کچھی تعلیم اور تجربے سے مت جاتی ہیں؟

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ ہسپتال کا ایک مختلف کاریڈور تھا۔ یہاں پر ایک رومنز کے دروازوں کی قطار نظر آرہی تھی۔ ہر کمرے کے باہر آرام دہ صوفوں کا ایل بنا تھا اور سامنے رکھی میز پر تازہ پھول بجے تھے۔ کونے میں ایک ریسیپشن تھی جہاں پہ بیٹھی خوبصورت لڑکی سے عیادت کے لیے آنے والے مہماں اپنے مریض کا روم نمبر پوچھتے، اور مطلوبہ کمرے تک چلے آتے۔ اگر مریض کے مہماں زیادہ ہو جاتے تو کچھ لوگوں کو کمرے کے باہر ایل شیپ صوفوں پر بٹھا دیا جاتا۔ لیکن چونکہ یہ امراء کا پرانیوں ایریا تھا، اس لیے یہاں داخل مہمانوں کی عیادت کرنے والے جس تیزی سے آتے، اسی تیزی سے واپس پہنچ جاتے تھے۔ اکثر کروں میں امراء کے بوڑھے والدین داخل تھے جن کے بچوں نے ان کے لیے تباہ دار اٹینڈنڈ رکھے ہوئے تھے۔ خود وہ کم کم ہی چکر لگاتے۔ کیونکہ جب وہ چھوٹے تھے ان کے والدین کے پاس ان کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔ آج ان کے پاس اسی وقت کی کمی تھی۔ ایسے میں کسی بھی کمرے کے سامنے بننے سنگ ایریا پر رش نہ لگا تھا۔

سوائے روم نمبر ۵۵۵ کے۔ یہ صوفے گز شستہ تین دن سے خالی نہیں ہوئے تھے۔

میز پر کھے گلدستے کے ساتھ کافی کے خالی کپڑے کھے تھے۔ ایک صوفے پر یہ بل بر اجمان تھا۔ رفتی شرک اور جیز پہنے، گھنگھریا لے بال الجھے الجھے سے لگ رہے تھے۔ جیکٹ ساتھ رکھی تھی۔ آنکھوں سے لگتا تھا وہ کئی دن

سے نہیں سویا۔ صوفے کے دوسرا رے کنارے پہ شبنم بیٹھی توئی اسکرین والے فون کو ہاتھ میں گھمارہ ہی تھی۔ بیربل کے برلنکس وہ ہر روز کی طرح صاف سترے لباس میں تازہ دم نظر آتی تھی۔

دفعتاً روم ۵۵۵ کا دروازہ کھلا اور چنگیز باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ سر جھکائے، احتیاط سے فرش پر رکھی ایک تار کو عبور کر رہا تھا۔ وہ ایک کارنر یمپ کی تار تھی جس کے قریب کوئی سوچ نہ تھا۔ سواس کو چوکھٹ کے اوپر دیوار سے گزارا گیا تھا۔ لیکن گز شستہ روز وہ نیچے گر پڑی تھی اور تب سے چوکھٹ پر پڑی تھی۔

”جو بھی اندر جائے، دھیان سے جائے۔ ورنہ یمپ کی تار سے اڑ کے گر سکتا ہے۔“ اس نے کوفت بھرے انداز میں باہر آکے اطلاع دی۔

”میں ایک بار گر چکا ہوں۔“ بیربل نے ایک ہاتھ بلند کیا۔

”میں بھی۔“ شبنم نے محض ایک انگلی بلند کی۔

”تم دو دفعہ گری ہو۔ اور میں نے دونوں دفعہ دیکھا تھا۔“

شبنم نے خفگی سے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا اور چنگیز کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کیا ماہربے اس کنڈیشن میں ہیں کہ ہم ان سے بات کر سکیں؟“

چنگیز جواب دیے بناریسیپشن تک گیا اور کہنیوں کے بل کا ونڈر پر جھکا۔

”کیا کوئی روم نمبر ۵۵۵ کے کارنر یمپ کی تار فکس کر سکتا ہے؟ وہ کل سے راستے میں پڑی ہے۔ کوئی اس سے اڑ کے زخمی ہو سکتا ہے۔ اللہ اللہ....“ دونوں ہاتھ اٹھا کے اکتا کے کہا اور سر جھکلتا پلٹ گیا۔ لڑکی نے سر ہلا کے فوراً سے ریسیور کان سے لگالیا۔

”فلموں میں تو ایسے نہیں ہوتا۔“ چنگیز واپس ایل شیپ صوفوں تک آیا تو شبنم ناراض نظر آرہی تھی۔

”کیا ہوتا ہے فلموں میں؟“

”مریض کو جیسے ہی ہوش آتا ہے، اس کے قریبی لوگ اس سے ملتے ہیں۔ اور وہ آہستہ سے آنکھیں کھول کے ان کو دیکھتا ہے۔ چند اپنا سیت بھری باتوں کے تبادلے ہوتے ہیں۔“ وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔ اور یہاں جب سے سر جری کے بعد ماہر کو ہوش آیا ہے، اس نے ایک دفعہ بھی ہم میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ اور صرف درد سے چلا جائے رہا ہے۔“

”کیونکہ اس کو درد ہورتا ہے، شبنم حاصل۔“ وہ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے سمجھا نے والے انداز میں کہنے لگا۔ ”تمہاری

فلموں میں ہر زخم کے ساتھ ہیر و کی برداشت بڑھتی جاتی ہے لیکن حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ انسان کی درد برداشت کرنے کی ہمت ہر نئی تکلیف پر کم ہو جاتی ہے۔ یہ ماہر کا پہلا ایکسٹر نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تکلیف بہت زیادہ ہے۔ اس لیے اسے دواؤں کے زیر اثر سلانے رکھنے میں ہی بہتری ہے۔“

”میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ماہر درد سے اتنا چلا سکتا ہے۔ چج۔“، شبنم نے دونوں کانوں کو چھوا۔ تھوڑی دیر کے لیے سنگ ایریا میں خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں اپنے فون پر لگے تھے۔ دفعتاً شبنم کھنکھاری۔

”ہم تینوں باری باری یہاں آکے ڈیوٹی دیتے ہیں۔ ہسپتال والے بھی سوچتے ہوں گے کہ ہماری کوئی لاکف نہیں ہے۔“

”اپنی بات کرو۔ میری لاکف ہے۔“ بیربل نے فون اسکرول کرتے ہوئے سر جھکتا۔

”اچھا؟ جب ماہر کے ایکسٹر کی خبر آئی تو تم کیا کر رہے تھے؟“

”میں ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا۔“ اس نے مسکرا کے پلکیں جھپکائیں تو شبنم بھی مسکرائی۔

”اور تب سے اس خوبصورت لڑکی نے تمہیں ایک کال نہیں کی۔“

بیربل کی مسکرا ہٹ غائب ہوئی۔ منہ میں کچھ بڑے اسکے واپسی فون پر جھک گیا۔

”جب سے ماہر کا ایکسٹر ہوا ہے؟“ ہم سب کی زندگیاں رک گئی ہیں۔ ”چنگیز بھی فون پر لگا تھا۔ وہ خود سے بولنے لگی۔“ زارینہ حاملہ کو دیکھ لو۔ صرف دو دفعہ آئی ہیں۔ کیونکہ اس کی لاکف ہے۔ پھر وہ کیف سنبھال رہی ہے۔ مالک اپنا کار و بار سنبھال رہا ہے۔ سب کی لاکف ہے سوائے ہم تینوں کے۔ کیونکہ شاید ہماری زندگیاں صرف ماہر کے گرد گھومتی تھیں۔“

”تمہارے خاموش ہونے کی کوئی ٹائمگنگ ہے یا مرضی سے ہوتی ہو؟“ بیربل فون پر چہرہ جھکائے بولا تو شبنم کا چہرہ سرخ ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کوہ کوئی جواب دیتی، بھاری جتوں کی آواز سنائی دی۔

ان تینوں نے سر اٹھا کے اس طرف دیکھا۔

عبدالماک فرید سامنے سے چلے آرہے تھے۔ ان کا سوت آج بھی بے شکن تھا۔ سفید بال جیل سے مجھے تھے۔ اور چہرہ بے تاثر تھا۔ شبنم اور بیربل بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ چنگیز نہیں اٹھا۔ وہ اپنی جگہ پہ بیٹھا، آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے انہیں آتے دیکھے گیا۔

”ماہر کیسا ہے؟“ مالک ایک صوفے پہ بیٹھے اور ٹانگ پہ ٹانگ جمای۔

”اس کی حالت اشتمیل ہے۔ لیکن سرجری کے بعد سے اس کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ اس لیے اسے زیادہ وقت sedated رکھتے ہیں۔“ بیربل واپس بیٹھتے ہوئے دھیمی آواز میں بتانے لگا۔ چنگیز بغور ان دونوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔

”یہ وہی ٹانگ ہے؟“ مالک کا لہجہ خشک تھا۔

بیربل نے سر کو بلکل سی جنبش دی اور بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”تم اس سے مل سکتے ہو۔“

”جب وہ ہوش میں آئے گا، تب مل لوں گا۔ مجھے اس کو چھینتے چلا تے دیکھنا پسند نہیں ہے۔“

مالک دو ٹوک انداز میں کہہ کے بند دروازے کو دیکھنے لگے۔ نظریں دروازے پہ لکھے نمبر پہ تھیں۔

”۵۵۵۔ ماہر کا کلی نمبر ۵۔ یہ کمرہ کس نے منتخب کیا تھا؟“

شبہم نے ایک ہاتھ اوپنچا کیا۔ مالک نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی اور واپس دروازے کو دیکھنے لگے۔

چند لمحے خاموشی سے گزرے۔ پھر بیربل کھنکھارا۔

”مجھے لگتا ہے ماہر کو کسی نے مارنے کی کوشش کی ہے۔“

”یقیناً اس مصیبت کو بھی خود اسی نے دعوت دی ہو گی۔“ ان کا لہجہ سرداور ہے تاثر تھا۔ جذبات سے مکمل عاری۔

”آپ اتنے دن سے کہاں تھے؟“ چنگیز کی نظریں ان پہ جھی تھیں۔

مالک نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔

”اور تم کون ہو؟“

”باش کو مر چنگیز۔ (چیف اسپکٹر چنگیز)“ اس نے والٹ کھول کے اپنائیں دکھایا۔ گردن خود بخواکر گئی۔

”میں ضرور بتاؤں گا کہ میں اتنے دن سے کہاں تھا، چنگیز آندی۔ لیکن میں ابھی فلاٹ سے آیا ہوں اور میں تھکا ہوا ہوں۔“ مالک فرید کی چھپتی نظریں اس پہ جھی تھیں اور لب میکانگی انداز میں ہل رہے تھے۔

”پہلے میں زارا کے اپارٹمنٹ جاؤں گا۔ وہاں فریش ہوں گا۔ پھر میں ڈی جی ایمنیٹ گنال مدرلو (ترکش پولیس) کے ساتھ شہر سے باہر جنگل میں شوٹنگ کے لیے جاؤں گا۔ (چنگیز کی کمر سیدھی ہوئی۔) ہم کچھ دیر کے لیے ٹیکٹھی کل شوٹنگ کریں گے۔ اور پھر میں اس سے پوچھوں گا کہ سریار کا باش کو مر میرے بھتیجے کے ایک سیڈنٹ کی تفتیش

کرنے کے بجائے ہسپتال میں بیٹھا کیا کر رہا تھا؟“

”میں...ابھی آیا تھا۔“ چنگیز تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا، رنگت بدلتی تھی۔ ”ہم اس کار کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”مجھے تمہاری پروگریس رپورٹ تمہاری بس سے مل جائے گی، باش کوسر بے۔“ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھے مالک نے کندھے اچکا دیے۔ اس کی بر قابلی نظریں چنگیز کے وجود میں پیوست ہو رہی تھیں۔
بیربل فرید کے چہرے پہ بلکل تی مسکراہٹ ابھر کے معدوم ہوئی۔

”میں چند ضروری کام نپنا کے آتا ہوں۔“ چنگیز نے سر کو خم دیا اور ان دونوں سے نگاہ ملانے بغیر تیزی سے لفت کی طرف بڑھ گیا۔

”مالک بے...“ شبنم کھنکھاری۔ ”وہ ماہر کا بہت اچھا دوست اور...“

”کیا میں نے تم سے پوچھا ہے، شبنم؟“ وہ اب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلا کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں ماہر کو دیکھتی ہوں۔“ وہ جلدی سے ۵۵ کا دروازہ کھول کے اندر رغائب ہوئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی مالک نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، لیکن بیربل نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔

”ایک منٹ...“ وہ غور سے کچھ سن رہا تھا۔

لمح بھر بعد اندر سے ٹھڈے کی آواز آئی۔ اور پھر شبنم کا ”آؤچ“۔

”اور یہ ہوئی ہیٹرک۔“ بیربل نے مطمئن سی سانس خارج کی اور پھر مالک کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم کچھ کہد رہے تھے؟“

”کیا اس کی ٹانگ ٹھیک ہو جائے گی؟“ وہ بغور بیربل کو دیکھ رہے تھے۔ انکھوں کی برف ویسی ہی تھی۔

”یہ گزشتہ ایک سیڈنٹ سے بدتر تھا۔ لیکن ڈاکٹر زکھر ہے ہیں۔ وہ چند ماہ میں اپنے قدموں پہ کھڑا ہو جائے گا۔“

”چند ماہ۔“ وہ اب بیربل کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ چہرہ موڑے مخالف سمت میں کمروں کی قطار کے سامنے رکھے خالی صوفوں کو دیکھ رہے تھے۔

”مالک... وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشان مت ہو۔“ بیربل بغور ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔ انہوں نے بس سر کو جنبش دی۔

”تمہارے پاس اس لڑکی کا نمبر ہے؟“
مالک نے چونکے اسے دیکھا۔

”کون سی لڑکی؟“

”وہی جس کو ماہر نے تمہارے کہنے پر چھوڑ دیا تھا۔ کشمائلہ۔“ اس کی آنکھوں میں کچھ جاتا ہوا تھا۔
”ہاں ہے۔ کیوں؟“ مالک کا چہرہ ویسا ہی تھا۔

”اس کو کال کر کے بتا دو کہ ماہر کا یکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ شاید وہ آنا چاہے؟“

”اب تم اپنے بھائی کے لیے ہمدردی طلب کرو گے؟“ بیربل پہ جمی ان کی آنکھوں میں ملامت ابھری تو اس کے ماتھے پہل پڑے۔

”کیا تم اسے کال کر سکتے ہو؟“

”نہیں۔ کیونکہ ماہر ایسا کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ اسے اس حالت میں دیکھے۔ میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں، بی۔“

”یا شاید تم اسے بتانا نہیں چاہتے۔“ بیربل کی آنکھوں میں جھنجھلاہٹ ابھری۔ ”اور ہاں... ماہر کو معلوم ہے کہ تم نے اس لڑکی کا ریستوران بکوایا تھا۔“

”اسے بہت پہلے معلوم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس نے کاغذات پر خود دستخط کیے تھے۔“ عبدالمالک فرید اسی طرح پرسکون بیٹھے رہے۔ ان کے ہاتھ صوف کے ہتھ پہ نادیدہ پیانو بجارتے تھے۔

”اس کے آنے سے شاید وہ جلد تندرست ہو جائے۔ کیا تم ایسا نہیں چاہتے؟“ اب کے بیربل نے لبھ کو بدل کے کہا۔

”کوئی لڑکی کسی مرد کو تندرست نہیں کر سکتی۔ بہتر ہو گا تم اپنی تو اتنای اپنے بھائی کا خیال رکھنے پر صرف کرو۔“ اسی لبھ میں کہہ کے مالک نے اپنا موبائل نکالا اور عینک ناک پہ لگاتے ہوئے چہرہ اسکرین پر جھکا دیا۔ بیربل بڑھاتے ہوئے رخ موڑ کے بیٹھ گیا۔



مبین منزل کے ڈرائیورگ روم کی کھڑکی کے آگے سے آدھا پردہ ہٹا تھا اور سرماں کی دھوپ اندر آ رہی تھی۔ خزان نے بہت سے پتوں کو خشک کر کے گرا دیا تھا۔ لیکن ماں کے سدا بھار پودے ویسے ہی کھڑے تھے۔ فضا میں دھونیں

جیسی اسموگ کی ملاوٹ بھی شروع ہو چکی تھی۔ ایسے میں ڈرائینگ روم کی خاموشی کو باہر سے آتی کسی پرندے کی سیٹی چیر رہی تھی۔ غوں غوں سس س۔ ایک غوں چھوٹا اور ایک بہت طویل۔ آواز میں وقفہ آیا تو صوفے پہ بیٹھی کشمائلہ نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

سامنے بڑے صوفے کے کنارے پہ زیاد سلطان بیٹھا تھا۔ پلوشرٹ کے اوپر پوری آسمین کا سوئیٹر پہنے، سر جھکائے وہ آگے ہو کے بیٹھا تھا۔

”جب سے میری امی بیمار ہوئی ہیں، میں آپ کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔ عجیب بے بسی ہے۔ کروں تو کیا کروں؟“ اس نے چہرہ اٹھا کے کشمائلہ کو دیکھا تو آنکھوں میں اداسی تھی۔ وہ اس اداسی کو پچانتی تھی۔

”علاج کروار ہے ہیں؟“ وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا گلبی پسید چہرہ میک اپ سے پاک تھا۔ بال اونچی پونی میں بندھے تھے اور پیروں میں عام سلیپرز تھے۔ سادہ شلوار قمیض کے اوپر وہ کندھوں پہ شال پیٹھے ہوئے تھی۔ سر ما بھی ٹھیک سے شروع نہیں ہوا تھا اور گھر کے اندر رہیڑ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

”سب کر رہوں کشمائلہ۔ لیکن وہ تند رست نہیں ہیں۔ اور میرا خوف ہر دن بڑھتا جا رہا ہے۔“

اسے لگا اس کے سامنے زیاد سلطان نہیں اس کا اپنا وجود بیٹھا ہے۔ چھے ماہ پہلے کا وجود۔ ڈاکٹر وہرا کے لکینک میں بیٹھی ڈری سہمی لڑکی۔

”وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں دعا کروں گی۔“ وہ ہلکا سامسکرانی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ پھر غور سے اسے دیکھا۔

”آپ کیسی ہیں؟“

کھڑکی کے پار پرندے کی لمبی سی غوں پھر سے سنائی دی تھی۔ وہ کہیں قریب ہی تھا۔ لیکن پرده آدھا برابر ہونے کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ چند گھنٹے ٹھیک گزرتے ہیں۔ ماں یاد سے نکل جاتی ہیں۔ پھر اچانک یاد آتا ہے کہ ماں چل گئی ہیں۔ اور یہ حقیقت کسی ہتھوڑے کی مانند سر پلگتی ہے۔ ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ لگتا ہے دل پھٹ جائے گا۔ ایسی گھٹن کہ دل چاہتا ہے زور زور سے چیخوں۔ اور پھر چند گھنٹے کے لیے وہ بھول جاتی ہیں۔ اور میں اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ یوں یہ سائیکل چلتا رہا ہے۔“

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کس کیفیت سے گزر رہی ہیں۔“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جیسے کہ وہ کیا کہے۔ وہ بھیگی

آنکھوں سے مسکرا دی۔

”اکثر میں بھول جاتی ہوں کہ وہ اب نہیں ہیں۔ گھر میں داخل ہوتی ہوں تو پہلا خیال ان کے پاس جا کے انہیں سلام کہنے کا آتا ہے۔ شام کی چائے میں ان کا ایک کپ زیادہ بنادیتی ہوں۔ رات کو ان کی انسولین نکالنے کے لیے فرتخ کھوتی ہوں تو یاد آتا ہے کہ اب کسی دوا کی ضرورت نہیں رہی۔“

”آپ ٹھیک نہیں ہیں۔“ وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں میں ٹھیک نہیں ہوں۔ لیکن میں خود کو ٹھیک کروں گی۔“ اس نے گھری سانس لے کر اثبات میں سر ہلا�ا۔ ”کیونکہ میرے پاس اب ایک مقصد ہے۔“

پرندے کاغوں زور سے بلند ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ زیادنا سمجھی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا مقصد؟“

”میں اس عامل کو ڈھونڈوں گی جو اتنے عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہے۔ پہلے وہ صرف مجھے نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے میری ماں پر بھی جا دو کیا۔ انہیں تکلیف دی۔“ حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکنے لگا لیکن وہ بہت ضبط سے اسے نیچے دھکیل گئی۔

”آپ اسے کیسے ڈھونڈیں گی؟“ وہ حیران تھا۔

” بتایا تو آپ مجھے منع کریں گے۔ کہیں گے کہ ایسے لوگوں کے پیچھے نہیں جانا چاہیے۔ ان سے دور رہنے میں بھلائی ہے۔ ہے نا؟“

وہ دھیرے سے مسکرا یا۔

”نہیں۔ میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔ آپ سمجھدار ہیں۔ اور اپنی حفاظت خود کر سکتی ہیں۔ آپ جو بھی کرنا چاہیں گی، مجھے اپنے ساتھ کھڑا پائیں گی۔“

وہ ٹھوس لبھے میں زمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ گیلی آنکھوں سے مسکرائی۔ کیا تھا اس شخص میں کہ جب وہ قریب ہوتا تھا تو دل خود اس کی طرف کھنچتا تھا؟

”تھینک یوز یاد۔“

”لیکن مجھے آپ کی حفاظت کی فکر ہے۔ آپ کسی عامل کے ٹھکانے پر بغیر سیکورٹی کے تنہا نہیں جائیں گی۔“ وہ تشویش سے کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن قدموں کی آواز پر خاموش ہو گیا۔

ماہی اندر چلی آرہی تھی۔ اسے دیکھ کے مسکرائی اور سر کے خم سے سلام کیا۔ وہ بھی مسکرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”زیادیہ ماہی ہے۔ میری بہن۔“

زیاد نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”آف کوس میں جانتا ہوں۔ ہم سہیل کی شادی پہ ملتے تھے نا۔“

”مالا اس وقت اپنے ریستوران میں اتنی الجھی ہوتی تھی کہ اسے ہم عام لوگ یاد نہیں رہتے تھے۔“ ماہی ملکے چکلنے انداز میں کہتے ہوئے آگے آئی تو وہ دونوں دھیرے سے ہنس دیے۔ پھر زیاد نے میز پر کھے شاپنگ بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

”امی نے آپ کے بے بی کا بتایا تھا۔ سمجھنہیں آیا کیا لے کر آؤں۔ ایئر پورٹ سے چاکلٹیس اٹھائیں۔“ پھر ایک گلہ آمیز نظر کشمکش پہ ڈالی۔ ”ان کو چاکلٹیس نہیں پسند۔ سو یہ آپ کی ہیں۔“

”تھینک یو۔ مجھے بہت پسند ہیں چاکلٹیس۔“ ماہی پورے دل سے مسکرا دی۔ چھوٹے بالوں پہ ہمیں بینڈ پیچھے کر کے لگائے، لمبا سا سوئیٹر پہننے، ماہی آج ہشاش بٹاش لگ رہی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ حور سورہ تھی۔

”غمینڈ آنٹی بتارہی تھیں کہ آپ کی ملکانی ہونے جا رہی ہے۔“

مالا نے اسے تادبی نظر وہن سے گھورا لیکن وہ ماہی تھی۔ مزے سے کہتے ہوئے سامنے والے صوفے پہ بیٹھی۔

زیاد سلطان کے چہرے پہ ایک سایہ سالہ رہا۔ لیکن وہ پچھا کہا مسکرا یا۔

”امی بیمار ہیں اور ابو کی خواہش ہے کہ...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

ڈرانینگ روم میں ایک تاؤ بھری خاموشی چھائی ہی تھی کہ باہر سے آتی غُرغون نے اسے ایک دفعہ پھر توڑ دیا۔

”چلیں مبارک ہو۔ ویسے آپ کی اگلی کتاب کہاں پہنچی؟“ مالا کی نگاہیں پڑھ کے اس نے خوشگوار انداز میں موضوع بدل دیا۔

”لکھر ہا ہوں۔“ وہ جیسے ایک دم بہتر محسوس کرنے لگا۔

”میں نے آپ کی پہلی کتاب کتنی دفعہ خریدنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا کارڈ آپ کی ویب سائٹ پر کام نہیں کر رہا تھا۔“

”میں آپ کو ایک کاپی بھیج دوں گا۔“ وہ مسکرا دیا۔

”لیکن آنکراف کے ساتھ۔ او کے؟“ ماہی مسکرا کے مزید کچھ کہتی لیکن دور کہیں سے نہیں حور کے رو نے کی آواز آئی۔ اس کے چہرے کی ساری خوشگواریت ہوا ہو گئی۔ جھنجھلا کے وہ اٹھی۔

”ماں اتنی تکلیف برداشت کر کے بچے کو دنیا میں لاتی ہے، اور سے اس کی شکل باپ پہ چلی جاتی ہے۔ اچھا مذاق ہے۔“

مالا بہش دی۔ زور سے ٹھکھلا کے۔ ہنئے سے اس کا چہرہ مزید گابی ہوا۔ وہ مسکرا کے اسے دیکھے گیا۔

”اصل میں حور کی آنکھیں ماں جیسی ہیں لیکن نقش عباد کے جیسے ہیں۔ اور ماہی سے یہ ہضم نہیں ہو رہا حالانکہ اکثر بچے باپ پہ ہی جاتے ہیں۔“

وہ جو اسے دیکھ کے مسکرا رہا تھا، اس بات پہ مسکرا ہٹ پھیکی ہوئی۔

”لیکن میں نہیں گیا۔“ کچھ تھا اس کے لجھے میں جو اس کر دینے والا تھا۔

”میرے ابا بہت گورے اور خوبصورت تھے۔ اور امی سے ان کی شادی زبردستی ہوئی تھی۔ انہیں امی کا رنگ پسند نہیں تھا۔ میری رنگت بھی امی پہ چلی گئی اسی لیے ان کو...“ اس نے ایک دفعہ پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”زیاد....“

”چھوڑیں میرے کمپلیکس کو، وہ زخمی سامسکرایا۔“ آپ اس عامل کوڈھونڈ نے کی بات کر رہی تھیں۔“

”میں نے اس کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس کا سکھ بنایا تو یاد آیا یہ میرے اسکول کا چپڑا تھا۔“

”ایک اسکول چپڑا تھا آپ کو کیوں نقصان پہنچانا چاہئے گا؟“

کشمائلہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ غرغمون کی آواز اب دھیمی ہو چکی تھی لیکن مسلسل گفتگو میں خلل ڈال رہی تھی۔

”اب وہ کہاں ہے؟“

”اسی شہر میں ہو گا۔ کل اسکول جا کے اس کا پیغام معلوم کروں گی۔“

”لیکن آپ تنہ انہیں جائیں گی اس کے پاس۔ ایسے لوگ خطرناک ہو سکتے ہیں۔ معید کو ساتھ لے کر جائیے گا۔“ وہ تشویش سے کھدرا تھا۔

”معید کو جادو اور جنات کی باتوں سے چڑھے۔ پہلے مجھے بھی تھی۔ اور ماہی اپنی بیٹی کو اکیلانہیں چھوڑ سکتی۔“ پھر ایک دم وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ ”آپ چلیں گے میرے ساتھ؟“

وہ ایک دم خاموش ہوا تو اسے اپنی جلد بازی کا احساس ہوا۔

”سوری۔ آپ یہاں پہ اپنی لان برانڈ کی کمپنیں کے لیے آئے ہیں اور.... (تحکوک نگاہ) اپنی منگنی کے لیے اور

ایسے میں آپ کو اپنے کاموں میں الجھالوں تو اچھائیں لے گا۔ ویسے بھی مجھے ڈر نہیں لگتا۔ میں کہیں بھی اکیلے جا سکتی ہوں اور....“

”میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“ وہ مسکرا کے بولا تو وہ جوتیزی سے وضاحت دے رہی تھی، رک گئی۔ ایک دم بہت سابو جھوکندھوں سے اتر گیا۔

”اتنا وقت کیسے نکالیں گے؟“

”آپ کے لیے وقت نکل آئے گا۔“ زیاد کی نظر میں اس پر جھی تھیں اور آواز میں کر چیاں سی تھیں۔ لمحے بھر کے لیے وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ پھر جیسے وہ سن چلا۔

”ویسے بھی اگر یہ وہی عامل ہے جو میری ماں پر جادو کر رہا ہے تو میں اسے ضرور ڈھونڈ ناچا ہوں گا۔“

اس کی بات نے ماحول میں ایک دم سے بھرتے تناوٰ کو تحلیل کر دیا۔ کشمائلہ نے گھری سانس لی۔

”مجھے یقین ہے کہ یہ وہی ہے۔ نہ صرف آپ کی امی بلکہ مجھ سے جڑے ہر انسان پر جادو میں یہی شخص ملوث ہے۔ میں *cursed* ہوں زیاد۔ اور جب کوئی انسان ایک دفعہ *cursed* ہو جائے تو اس کے قریب آنے والے ہر انسان کو وہ جادو چھو نے لگتا ہے۔“

”اسی لیے آپ نے شادی سے انکار کیا تھا۔ آپ نہیں چاہتی تھیں کہ آپ کے وجود سے لپٹا جادو مجھے چھوئے۔“ وہ زخمی سماں کرایا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میرے قریب جو بھی آئے گا، یہ جادو اس کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ مجھے نہیں معلوم ایسا کیوں ہے، لیکن یہ میرا دل کہتا ہے۔ میں اس جادو کا مرکز ہوں۔ وہ عامل صرف مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ میں اپنی وجہ سے مزید کسی کو ہرث نہیں ہونے دینا چاہتی۔“

”کاش آپ مجھے یہ پہلے بتا دیتیں۔ جو لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، وہ آپ کو آپ کی ہر curse کے ساتھ قبول کرتے ہیں، کشمائلہ۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ اس سے پہلے کوہ کچھ کہتی، اس نے تیزی سے بات بدل دی۔

”بہر حال وہ سب ماضی میں ہے۔ اب آگے بڑھنے کا وقت ہے۔ اور اس عامل کو روکنے کا۔“ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کو جب میری ضرورت ہوگی، میں ایک کال کے فاصلے پر ہوں گا۔“ وہ متانت سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہوئی۔

”تحینک یو زیاد۔ آپ کا کہنا ہی کافی تھا۔“ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ زیاد کافون تھرھرانے لگا۔

”آفس سے کال آرہی ہے۔ میں چلتا ہوں۔“

ٹھک ٹھک... اب غمزغوں کے ساتھ شیشہ بھی بجھنے لگا۔

”یہاں کچھ ہے۔“ وہ چونکا۔ مالاتیزی سے کھڑکی تک آئی اور پرده کھینچ کے ایک طرف کیا۔ پھر متلاشی نظرؤں سے لان کو دیکھا۔ دائیں بائیں۔ اورتب ہی اس کی نگاہ کھڑکی کے نچلے حصے پر پڑی۔ وہاں منڈیر پر ایک فاختہ ٹھہر پڑی اپنی چونچ سے شیشے کو مسلسل بجارتی تھی۔ اس نے جلدی سے شیشے کا پٹ سلانیڈ کیا تو ایک دمٹھنڈی ہوا اندر آئی۔ وہ نیچے جھکی اور دونوں ہاتھوں میں فاختہ کو اٹھا کے اونچا کیا۔ اس کا ایک پرخی تھا اور اس پر خون جما تھا۔

”چھ میرے اللہ...“ اس نے جلدی سے سلانیڈ نگ ڈور بند کیا اور مڑی تو دیکھا، وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا یہ زخمی ہے؟“

”یا اتنی دیر سے ہمیں بلا رہی تھی اور ہم سمجھہ ہی نہیں سکے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اسے گود میں لٹادیا۔ پھر اس کا پر احتیاط سے اونچا کر کے دیکھا۔ وہاں کٹ سارا گا ہوا تھا جس پر خون جما تھا۔ اس کی نظریں فاختہ کے پنجوں تک گئیں۔ ان میں ایک ٹھہنی پھنسی تھی۔

”یا اپنے گھونسلے کے لیے ٹھہنی لے کر جارتی تھی۔ یہ ایک ماں ہے اور اس کے پچھے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ سر جھکائے اس کے پر کامعاں کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ زیاد سلطان اداں مسکراہٹ کے ساتھ صوف پہنچی لڑکی کو دیکھے گیا جس کی ساری توجہ زخمی پرندے کی طرف تھی۔ اس کا فون پھر سے تھرہ رانے لگا۔

”میں چلتا ہوں۔ مجھے اس کی خیریت کی خبر دیجئے گا۔“

اس نے سرٹھائے بغیر گردن ہلا دی۔ اب وہ بخت بی کو آواز دے کر معید کا فرست ایڈ باکس مانگ رہی تھی۔ اس کا دھیان بٹ چکا تھا۔ گود میں رکھی فاختہ درد سے ہلکا ہلکا چاہا رہی تھی۔ زیاد مزید کچھ کہے بنا بہر نکل گیا۔

لا اونچ میں حور کافیڈ رہا تھا میں لیے فارمولہ مکس کرتی ماہی نے خاموش نظرؤں سے اسے جاتے دیکھا۔ اور پھر اپنے موبائل کو۔

(کم بخت) کسی کی شان میں بڑا کے اس نے فیڈر پچی کے منہ میں ڈال دی۔



کمرہ نمبر ۵۵۵ کے سامنے رکھے صوفے رات کے اس پھر خالی تھے۔ شبم نے آنے کا کہا تھا لیکن ابھی تک پہنچی نہیں تھی۔ بیربل کچھ دیر اس کا انتظار کرتا رہا، پھر دروازہ کھول کے کمرے کے اندر چلا آیا۔

کمرے میں نائٹ بلب جلا تھا۔ اندر دوسرا قدما رکھتے ہی اس کا پیروتار سے الجھا اور اسے زور کا ٹھہڑا آیا۔ بدقت دیوار کا سہارا لے کر وہ گرتے گرتے بچا۔ زیرلب ہسپتال والوں کے لیے چند کلمات کہہ کے اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ اور پھر اس پر تھیش کمرے کو دیکھا جس میں اس کا بھائی گزشتہ چند روز سے مقید تھا۔

کمرے کے دو حصے تھے۔ آغاز میں ایک بڑا سا سٹنگ ایریا بنا تھا جس میں چند صوفے رکھے تھے۔ وسط میں رکھی میز گلڈستوں سے بھری تھی۔ ان کے پیچھے آدمی دیوار بنی تھی اور آدمی جگہ خالی تھی۔ خالی حصے سے کمرے کا دوسرا حصہ دکھائی دیتا تھا جہاں مریض کا بیڈ رکھا تھا۔ آدمی دیوار کے باعث بیڈ یہاں سے آدھا دکھائی دیتا تھا۔

بیربل چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا آگے آیا۔ یہاں تک کہ وہ بیڈ کی پانچتی کے ساتھ آ رکا۔

اس حصے میں ایک طرف بیڈ رکھا تھا۔ سامنے ایک صاف دیوار تھی جس پر اونچائی وی نصب تھا۔ ٹوی کے عین نیچے اسٹنڈی ٹیبل اور چیسر کھی تھی۔ بیڈ کے دائیں طرف ایک دیوار گیر فرنچ کھڑکی تھی جس کے پار دور تک پھیلا استنبول دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی کے مکمل عرض جتنا ایک طویل کاؤنٹ اس کے ساتھ لگا تھا۔ کونوں میں زرد کار زر لپیس جل رہے تھے اور سارے کمرے سے تازہ پھولوں کی خوشبو آرہی تھی۔

بیڈ پہ ماہر ایسے لیٹا تھا کہ گردن پہ کالر چڑھا تھا اور چہرے پہ گئے نیل اور کٹ واضح دکھائی دیتے تھے۔ سب سے نمایاں کٹ دائیں گال کے وسط سے کان تک جاتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹیپوں اور پلیسٹر میں جکڑی تھی اور اس کو سپورٹ دے کر ایک خاص زاویے پر قدرے اٹھایا گیا تھا۔ ہونٹ خشک اور آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھوں میں مختلف تاریں اور نالیاں لگی تھیں۔ کسی مشین سے مسلسل پپکی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

”ماہر....“ وہ سٹنگ ایریا سے ایک کرسی اٹھا لایا اور اس کے سر ہانے کے قریب رکھ کے بیٹھا۔ ماہر کی آنکھیں بند رہیں۔ بیربل کی نظریں اس کی ڈرپ تک گئیں۔ پین کلر دی جا چکی تھی۔ یقیناً وہ نیند میں تھا۔

”ماہر....“ وہ پھر سے کھنکھارا۔ جواب ندارد۔

کھڑکی سے باہر نظر آتا استنبول بھی خاموش تھا۔ سوائے مشین کے بپپ کے ہر طرف خاموش تھی۔

”ایک بات کہوں ماہر؟“ وہ زخمی سامسکرایا۔

”تم سے جیلیس ہونے کے لیے میرے پاس بہت سی وجوبات تھیں۔“ اس کی آواز بہت بلکل تھی جیسے کسی سمندر کی تہہ سے آرہی ہو۔

”تم ہمیشہ مجھ سے بہتر تھے اور میں سب کی سینئنڈ چوائس ہوتا تھا۔“ وہ اداسی سے مسکرا کے کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔

”میں کبھی بھی ماہر فرید کے سامنے کچھ نہیں تھا۔ کس کے گریڈ زیادہ اچھے ہیں؟ ماہر کے۔ کون ابا کی طرح بزنس کر سکتا ہے؟ ماہر۔ کون لوگوں سے تعلقات بنانے میں کامیاب ہو گا؟ ظاہر ہے ماہر۔“

کھڑکی کے شیشے پر سر جھکائے بیٹھے گھنگھریا لے بالوں والے نوجوان کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

”لوگوں کی طرف مائل ہوتی ہیں؟ ماہر کی طرف۔ کس نے ابا اور مالک کی ذہانت لی ہے؟ ماہر نے۔ بہت سے لوگ آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ قاسم فرید کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اور مجھے وہ مالک کا بیٹا سمجھتے ہیں۔“ وہ ہلکا ساہنسا۔ ”اور اسی لیے مالک کو میں شدید ناپسند ہوں کیونکہ میری شکل اس سے ملتی ہے۔ اور کچھ عادتیں بھی۔ میں بھی اس کی طرح لیکھوڑ انٹولیرنٹ ہوں۔ وہ زیادہ خخر کرتا اگر لوگ ماہر کو اس کا بیٹا کہتے لیکن بے چار مالک۔“ وہ پھر سے ہنسا۔ اس کی پنسی فضائیں گونجی اور پھر معدوم ہو گئی یہاں تک کہ پیچھے صرف ایک اداسی رہ گئی۔

”لوگ تمہیں قاسم فرید کا واحد بیٹا اسی لیے سمجھتے ہیں کیونکہ وہ صرف تمہیں جانتے ہیں۔ بیربل کو کوئی نہیں جانتا۔ بیربل کی کسی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کہا نا... میرے پاس تم سے جیلیس ہونے کی بہت سی وجوبات تھیں۔ لیکن....“

اس نے چہرہ اٹھایا۔ اس کی آنکھیں گیلی تھیں۔

”لیکن میں کبھی تم سے کبھی جیلیس نہیں ہو سکا۔“

ماہر کا وجود آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت لیٹا تھا۔

”میں نے کوشش کر کے بھی دیکھ لیا۔“ اس نے پلکیں جھپکائیں تو چند گرم آنسو چہرے پہ جا گرے۔ ”جب لوگ ہم دونوں بھائیوں کا موازنہ کرتے تھے، میں نے چاہا کہ میں اس موازنے کا الزمام تمہیں دوں... لیکن میں نہیں دے سکا۔ ابا کو دیا۔ ہمیشہ دیا۔ انہوں نے ہمیشہ ہم میں فرق کیا تھا۔“ اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔

”تم نہیں مانتے اور نہیں مانو گے کیونکہ تم اچھے بیٹے ہو لیکن انہوں نے ایسا کیا تھا۔ انہوں نے میرے اوپر جلد ہار

مان لی۔ کیا میں کام نہ سیکھتا اگر وہ مجھ پر زیادہ محنت کرتے؟ اگر وہ مجھے زیادہ وقت دیتے؟ اب انے میرے اوپر وہی طریقہ اپلاٹی کرنا چاہا جو وہ تم پر کرتے تھے۔ ہر بچہ ماہنگیں ہوتا جو ایک دفعہ کی سنی ہوئی بات کو سیکھ لے۔ ہر بچہ مختلف ہوتا ہے۔“

مشین کی پ پ مسلسل جاری تھی۔

”لیکن میں کبھی بھی تمہیں الزام نہیں دے سکا۔ جب تم ماں کے خلاف ہو گئے تو بھی نہیں۔ مجھے اپنی ماں بہت عزیز تھی مہر۔“ اس کے گرتے ۲ نسوان میں تیزی آگئی تھی۔ ”میری ماں سے غلطی ہوئی تھی بس۔ میں نے انہیں بہت شروع میں معاف کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی میں نہ سکو دیتا ہوں۔ ماں یا تمہیں میں کبھی غلط نہیں سمجھ سکا۔ یہ بیربل کی مجبوری ہے۔“

اس نے سراٹھا کے سیاہ شیشے میں اپنا عکس دیکھا اور دونوں ہتھیلیوں سے چہرہ رگڑا۔

”میں تمہیں پیسہ بنانے کی مشین نہیں سمجھتا۔ مجھے تم سے پیسے بھی نہیں چاہیے ہوتے ہیں۔ شاید تم مجھے spoil کرنا چھوڑ دو تو میں اپنے پیرا پر کھڑا ہو سکوں۔ تم بھی مجھے اپائل کرتے ہو، مہر۔ ابا کی شرط تھی کہ میں کسی کی مدد کے بغیر اپنا کار و بار سیٹ کروں گا لیکن...“ وہ بیخی سے دھیرے سے ہنسا۔ ”میری بیکری ایک فلاپ بیکری ہے۔ لیکن جب کوئی بڑا آرڈر اچانک سے آتا ہے، میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ تمہارا کوئی کار پوریٹ سیکٹر کا دوست ہے جس سے تم نے میری بیکری کی سفارش کی ہے۔ مجھے سب سمجھ میں آتا ہے، مہر۔ میں بس کہتا نہیں ہوں۔ اور جو میں کہتا ہوں، وہ دل سے نہیں کہتا۔“

وہ اب ماہر کی بند آنکھوں کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ بلکی بڑھی شیو۔ نیل۔ زخم کے نشان۔ اس کے سانس لینے کی بلکی بلکی آواز۔

”میں وہ سب اس لیے کہتا ہوں کیونکہ مجھ تم پر غصہ آتا ہے جب تم ہلال کوزندہ ڈھونڈنے کی بات کرتے ہو۔ وہ نہیں ہے مہر۔ وہ نہیں ملے گی۔ مجھے تب بھی غصہ آتا ہے جب تم کشمالة اور اس کے مسئللوں کے پیچھے بھاگتے ہو۔ کیونکہ میں مالک کی طرح خود غرض ہوں۔“ ۲ نسوان پھر سے آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔ ”ہم دونوں تمہیں صرف اپنے لیے چاہتے ہیں۔ جیسے مالک چاہتا ہے کہ تم لندن چلے جاؤ تو یہی میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ استنبول رہو۔ میرے ساتھ۔“

اس نے پھر سے سر جھکایا۔ ۲ نسوان زار و قطار گر رہے تھے۔

”ابا... ماں... بلال۔ میری ساری فیملی ختم ہو چکی ہے۔ اوپر سے تمہارا ایکسٹرنٹ۔ میں تین دن سے نہیں سوسکا یہ سوچ کے کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتا؟“

اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔ خوف تھا

”اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتا، ماہر؟“

”کیا کرتے؟ ساری جانیدادا پنے نام کروالیتے اور کیا کرتے۔“ وہ بند آنکھوں سے بڑ بڑا یا۔
بیربل فرید نے کرنٹ کھا کے گردن سیدھی کی۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”تت... تم... مجھے سن سکتے ہو؟“

”کو ماں نہیں ہوں۔ زندہ ہوں۔ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور تم بولے جا رہے ہو۔ بولے جا رہے ہو۔“
وہ بند آنکھوں سے برہمی سے کہہ رہا تھا۔

بیربل کامنہ کھل گیا۔ چند لمحے لگے اسے سمجھنے میں اور پھر اس نے جلدی سے چہرہ صاف کیا۔

”میں یہ سب ایسے ہی...“
”زس کو بلاو۔ مجھے کچھ چاہیے... پین کلر، نیند کی دوا...“ اس کی اکتا ہٹ بھری آواز میں کراہ در آئی تھی۔
بیربل کے ابر و خفگی سے اکٹھے ہوئے۔ پیر پنج کے اٹھا۔

”زہر کے بارے میں کیا خیال ہے۔ تھوڑا سلا دوں؟“

ماہر نے آنکھیں کھولیں۔ ان میں سارے زمانے کی بے زاری تھی۔ بدقت اس نے آئی وی لائیں لگا ایک ہاتھ
اٹھایا۔ بیربل اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔

ماہر نے انگشت شہادت بلند کی۔ اشارہ دروازے کی طرف تھا۔

بیربل ہونہہ میں سر جھلتا پلٹ گیا اور دروازے تک آیا۔ احتیاط سے تار عبور کی۔ لیکن دروازہ نہیں کھولا۔ پہلے آنکھیں صاف کیں۔ پھر کھنکھار کے اپنی آواز درست کی۔ اس کے بعد چہرے پہ نارمل مسکراتا ہوا تاثرا لایا اور دروازہ کھولا۔

باہر کان لگائے کھڑی شبنم بے اختیار گرتے گرتے پیچی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا۔

شبنم نے بدقت دیوار کا سہارا لیا، پھر عینک کے پیچھے سے اسے ناراضی سے گھورا۔

”میں تین دن سے نہیں سویا۔“ منہ بگاڑ کے بیربل کی آواز نکالی۔ ”اس لمبے کاؤچ پر لگاتار چھے چھٹے کون سوتار ہاہے، ہاں؟“

”تم سب ایک جیسے ہو۔ میں کسی سے بات نہیں کروں گا اب۔“

وہ خفا خفا سا بڑا بڑا ہوا کار پیڈور میں آگے بڑھ گیا۔



کشمائلہ کے کمرے کے ایک کونے میں ہیٹر دہک رہا تھا۔ اس کے سامنے بچھے کمبل پر زخمی فاختہ لیٹتھی۔ وہ گھنٹوں کے بل ز میں پہنچھی فکرمندی سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ معید ساتھ بیٹھا اس کی پٹی کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے سراٹھایا تو وہ امید سے اسے دیکھنے لگی۔

”اس کو ویٹ کے پاس لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ راستے میں ہی مر جائے گی۔“
”ایسے نہ کہو۔“

”اس کو بس گرم رکھو۔ شاید یہ آنکھیں کھول دے۔“ اب وہ نرمی سے بولا تو مالانے چہرہ جھکا کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیم و تھیں۔ اب وہ آواز میں نہیں نکال رہی تھی۔ بس یونہی لیٹتھی تھی۔

”تم نے کچھ سوچا؟“

”میں ابھی لا ہو رچھوڑنا نہیں چاہتی، معید۔“

”تم بہتر محسوس کرو گی۔ سوق کے تو دیکھو۔ آرام سے۔ کوئی پریش نہیں ہے۔“

وہ پھیکا سامسکردا دی اور سر ہلا دیا۔ معید کے جانے کے بعد دروازہ ہلکا سا بجا تو اس نے گردن موڑ کے دیکھا۔ ماہی چوکھت میں کھڑی تھی۔

”خور سوگئی؟“

ماہی جھر جھری لیق اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں چاکلٹیں تھیں۔

”کبیرہ تائی کے سارے جن ایک طرف اور یہ ایک جن دوسری طرف۔“ باری باری دونوں کانوں کو چھوا۔ ”مجھ سے ایک نہیں سنبھلتی اور مان نے نہ جانے کیسے ہم تین پالے ہوں گے۔“

وہ کھڑکی کے ساتھ رکھے کاؤچ پر تکان سے ڈھیر ہو گئی اور چاکلٹ گود میں رکھ کے کھولنے لگی۔

”کیا یہ زندہ ہے؟“ ترجم سے کمبل پر لیٹتھی فاختہ کو دیکھا جو ادھ کھلی آنکھوں سے اسی طرف دیکھ رہی تھی جہاں ماہی

بیٹھی تھی۔ مالانے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔

”زیادکل تمہارے ساتھ اسکول جائے گا؟“

” وعدہ کر کے گیا ہے۔“ پھر اس نے بظاہر لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔ ”نہ بھی گیا تو میں اکیلی چلی جاؤں گی۔“

”ویسے اچھا ہے، زیاد۔ نرم مزاج اور بات ماننے والا۔“ وہ چاکلیٹ دانت سے کترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”جج بتاؤں تو پہلے مجھے اتنا پسند نہیں تھا وہ۔ لیکن اتنے عرصے بعد اسے دیکھا ہے تو اچھا لگا ہے۔“

وہ چہرہ جھکائے زخمی فاختہ کے پر پہ دو انگلیاں پھیرتی رہی۔ ماہی بغور اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”تم اس کو انکار کر کے پچھتارہی ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے گہری سانس لے کر سرنگی میں ہلا کیا۔ ”زیاد میری قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ وہ اپنی پچھوکی بیٹی کا مقدرت تھا۔ اسی کو ملے گا۔“

”مجھے لگتا ہے وہ یہ شاید اپنے ابوکی وجہ سے کر رہا ہے ورنہ وہ اب بھی تمہیں پسند کرتا ہے۔“ ماہی سوچ سوچ کے بول رہی تھی۔ ”ورنہ وہ کیوں تمہارے ساتھ اسکول جا رہا ہے؟ شاید وہ تمہارے قریب رہنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔“

”وہ ایک اچھا دوست ہے۔ اور کچھ نہیں۔“ پھر اس نے ماہی کی گود میں رکھی چاکلیٹس کو دیکھا اور مسکرا دی۔ ”زیاد کی لائی ہوئی چاکلیٹس اچھی لگی ہیں تمہیں۔“

”ماہی نے کبھی چاکلیٹس اور گوپ کو انکار نہیں کیا۔“ وہ مزے سے مسکرائی۔ پھر ایک اس کی طرف بڑھائی۔ ”کھالو۔ میرا تو صرف بہانہ ہے۔ اصل میں وہ تمہارے لیے ہی لایا ہو گا۔“

اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلا کیا۔ ”مجھے نہیں پسند چاکلیٹس۔ اور تم بھی کم کھاؤ۔ اتنا وزن کیسے کم کرو گی؟“

”وزن نہ یاد دلایا کرو، یار۔“ ماہی نے برآمدہ بنایا اور چاکلیٹ نیچ کر لی۔ چند لمحے کے لیے سوچتی رہی۔

”نہ کسی کی شادی قریب آ رہی ہے۔ نہ ہی کسی نے اب مجھے پسند کرنا ہے۔ چھوڑ وزن کو۔“ دوبارہ سے چاکلیٹ اٹھا لی اور بڑی سی بائٹ لی۔ ”بس دانے نہ نکلیں، باقی خیر ہے۔“ وہ مزے سے چاکلیٹ کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

(بس دانے نہ نکلیں۔) فاختہ کے پروں پر حرکت کرتا اس کا ہاتھ تھم گیا۔ البتہ اس نے سرنیں اٹھایا۔ بس اس نہیں پرندے کے سرمنی وجود کو دیکھ لگئی۔

(بس دانے نہ نکلیں۔)

فاختہ کے سرمنی پروں کے درمیان سفیدی تھی۔ وہ سفید دھیرے دھیرے سارے منظر نامے پر غالب آنے لگی۔ یہاں تک کہ اردو گرد سب کچھ سفید ہو گیا۔

پھر اس سفیدی میں چند بھورے بلاکس ابھرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ چند ڈیسک بن گئے جو قطار میں رکھے تھے۔ ایک ڈیسک کے پیچھے بچ پر اسکوں یونیفارم پہننے اور بچی پونی بنانے، ایک لڑکی بیٹھی کاپی پر کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کی جھکی آنکھیں بزر تھیں اور سپید گابی چہرے پر بہت سے دانے نکلے تھے۔

دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ کوئی قریب آیا ہے۔ نظر اٹھا کے دیکھا تو ایک لڑکی اپنا بیگ لیے اس طرف آ رہی تھی۔ بزر آنکھوں والی لڑکی مسکرا کے ایک طرف کھسک گئی اور ساتھ جگہ بنا دی۔ اب وہ امید سے نئی بچی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی قریب پہنچی تھی کہ اگلی نشست پر بیٹھی لڑکی ایک دم پڑی۔ اس کے بالوں پر گابی ہسیر بینڈ لگا تھا، اور اس کی آنکھوں میں ایک مختلف سی چمک تھی۔ اس کے پلٹتے ہی بزر آنکھوں والی لڑکی کی مسکرا ہٹ غائب ہوئی۔ چہرے پر خوف سا ابھرا۔

”تم یہاں بیٹھو گی؟ کشمکالہ کے ساتھ؟“ گابی ہسیر بینڈ والی لڑکی چکیلی آنکھوں سے مسکرا ائی۔ وہ سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔ کیوں؟“

”سوق لو۔ پھر تمہیں بھی ایسے دانے نکل آئیں گے۔“

ایک قہقہہ ساتھ ہی گونجا۔ بزر آنکھوں والی لڑکی کا سر زید جھک گیا۔ کاپی پر گنگ بھرتی پنسل میں تیزی آ گئی۔

”تم میرے ساتھوں کوور چلو۔“ آواز پر وہ چوکی۔ ذہن کسی گہری کھائی سے نکلا تھا۔

صوفے پر پیر اوپر کیے بیٹھی ماہی چاکلیٹ کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”معید کہتا ہے اتنبول چلو۔ تم کہتی ہو وین کوور چلو۔ کیا میری اپنی کوئی زندگی نہیں ہے؟ مجھے اپنی زندگی سیٹ کرنے دو یار۔“ وہ ایک دم چڑھے پن سے کہہ کے وہاں سے اٹھ گئی۔ ماہی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اسے ایک دم سے کیا ہوا۔“ پھر کندھے اچکا کے چاکلیٹ دانت سے کترنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس صبح روم نمبر ۵۵۵ کے باہر لگے کاؤچ پیربل فرید خاموشی سے بیٹھا مو باٹل دیکھ رہا تھا جب بلاک ہیلڈ کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر زید جھکا لیا۔

”تمہاری اپنیش لاتے، کوونٹ ملک کے ساتھ۔“ شبنم نے مسکرا کے دو کپ سامنے رکھے۔ بیربل نے سر نہیں اٹھایا تو اس نے ایک کپ اس کی طرف دھکیا۔

”وہ تکلیف میں ہے، بیربل۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں کہنے لگی۔ ”اسی لیے چڑچڑا ہورہا ہے۔ ورنہ اسے تمہارے جذبات کی قدر ہے۔“

بیربل نے رخ مزید پھیر لیا اور انگلیاں کی پیڈ پتیزی سے چلنے لگیں۔

”میرے پاس ایک آئندیا ہے۔“ وہ اس کا چہرہ بغور پڑھ رہی تھی۔ وہاں کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔

”اس لڑکی کو کال کرنے کے لیے۔“ اس نے بات مکمل کی ہی تھی کہ بیربل نے تیزی سے گردن موڑی۔

”کیسے؟“

شبنم نے مسکرا کے کوٹ کی جیب سے ٹوٹی اسکرین والا فون نکال کے سامنہ رکھا۔

”ہمیں ماہر کا پاس کوڈ معلوم نہیں ہے۔ نہ وہ ہمیں اپنا فون کھولنے دے گا۔“

”جانتی ہوں۔ لیکن Siri یہ نہیں جانتی۔“ شبنم کی آنکھیں چمکیں۔ ”سری ماتقی جلتی ایک ہی صنف کی آواز کو اپنے مالک کی آواز ہی سمجھتی ہے۔“

اس نے فون بیربل کی طرف بڑھایا تو وہ چونکا۔ پھر فون تھام کے چہرے کے قریب کیا۔

”ہے سری؟“ آواز کو قدر رے گھمیر کر کے بولا تو فوراً جواب آیا۔

”لیں؟“

وہ دونوں مسکرا دیے۔

”اب اس لڑکی کا نام لو اور اسے کال کرو۔“

بیربل کی مسکرا ہٹ معدوم ہوتی۔ ”ماہر اپنے فون میں نمبر زاصل نام سے محفوظ نہیں کرتا۔ مجھے نہیں معلوم اس نے اس کا کیا نام رکھا ہوا ہے۔“

”اوہ۔“ شبنم کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”لیکن....“ وہ ایک دم سیدھا ہوا۔ دماغ تیزی سے چلنے لگا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ ماہر نے اس کی بہن کا نمبر کس نام سے محفوظ کیا تھا۔“ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

”ہے سری....“ موبائل ہونٹوں کے قریب کر کے بولا۔ ”کال ون ان ففتی۔“

”کانگ ون ان فنی۔“ فوراً سے تعقیل ہوئی۔ بیربل نے مسکرا کے اپنیکر آن کیا اور پیچھے ہو کے بیٹھتے ہوئے کافی اٹھائی۔ وہ بھی پر جوش سی ہو پیٹھی تھی۔

چند لمحے وہ دونوں طویل گھنٹی سنتے رہے۔ پھر... دوسری جانب سے کال کاٹ دی گئی۔

مسکرا ہٹ ان دونوں کے چہروں سے غائب ہو گئی۔ شبکم کے ماتھے پہ بل پڑے اور اس نے تیزی سے اس کے ہاتھ سے فون لیا۔

”گلتا ہے ماہر بے کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ ہونہہ۔“ بمرے موڑ سے کہتے ہوئے اس نے اپنی کافی اٹھائی۔



”میں دس منٹ تک آپ کے گھر کے باہر ہوں گا۔“

جس وقت زیاد کامیتیخ آیا، وہ آئینے کے سامنے کھڑی، لمبے بالوں کو اونچی پونی میں باندھ رہی تھی۔ تبھی نگاہ دائیں گال پہ پڑی۔ وہاں ایک سرخ گلابی سادا نہ نکل رہا تھا۔ اوہ نو۔ اس نے کوفت سے سنگھار میز کا دراز کھولا۔ ایک پیکٹ باہر نکلا جس میں بہت سے پہلے اسکرزر کھے تھے۔ ایک نخساں اگول اسکر اتار کے دانے پہ چپاں کیا اور پھر گھری سانس لی۔

دل کی دھڑکن جو چند لمحے کے لیے بے ترتیب ہوئی تھی، اب نارمل ہونے لگی۔ اس نے تنقیدی نظروں سے گال پہ لگے اسکن کلر کے اسکر کو دیکھا۔ وہ اتنا ہی برالگ رہا تھا جتنا کہ دانہ۔ لیکن بس چند گھنٹے کی بات ہے اور پھر یہ غائب ہو جائے گا۔ دوبارہ نہیں۔ پلیز اللہ تعالیٰ۔ دوبارہ نہیں۔

خود کو سلی دیتے ہوئے اس نے سن گاسن ماتھے پہ اٹکائے اور ایک آخری نظر خود پہ ڈالی۔ وہ سیاہ شارٹ شرٹ اور سیاہ کھلٹا اوزرس میں ملبوس تھی۔ سفید دو پئے کو گرد پیکٹ کے اس کے دونوں پلوس سامنے گرار کھے تھے۔ وہ تیار تھی۔ اپنے پرانے اسکول جانے کے لیے مکمل تیار۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کندھا چوکھٹ سے ٹکرایا تو وہ رکی۔ تکلیف سے آنکھیں بند کیں۔

بند آنکھوں کے پار ایک دھنڈلی سی راہداری دکھائی دی۔ اوپنجی پونی والی لڑکی سر جھکائے، کندھے پہ بیگ لٹکائے چلتی جا رہی تھی کہ کسی کا کندھا اس سے زور سے ٹکرایا۔ اس نے چونک کے سراٹھیا۔ ساتھ سے گزرتی گلابی ہنپیر بینڈ والی لڑکی دھیرے سے بولی تھی۔

”pimples“، اور پھنس کے آگے بڑھ گئی۔ اس کا جھکا سر مزید جھک گیا۔

فون کی تیز گھنٹی نے اسے جیسے کسی خواب سے جگایا۔ ذہن سے تمام یا دوں کو جھکتی، کشمائلہ باہر نکلی تو دیکھا، آواز پچن سے آ رہی تھی۔ یہ ماہی کے موبائل کی اولڈ فون رنگ ٹوں تھی۔

”ماہی... تمہارا فون نج رہا ہے۔“ وہ اطلاع دے کر خارجی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ زیاد پہنچنے والا تھا۔

”مالا یار دیکھ لو کس کافون ہے۔ عباد کا ہو گا۔“ ماہی نے اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے سر نکال کے کہا۔ اس کا لہجہ چڑھا اور حلیہ اول جلوں ساتھا۔ پس منظر میں حور کے رو نے کی آواز آ رہی تھی۔

مالا نے ایک ترجم بھری نگاہ اس پڑالی اور قدموں کا رخ پچن کی طرف موڑ لیا۔ کاؤنٹر پر کھافون مسلسل چنگھاڑ رہا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کے فون اٹھایا اور اسے لیے آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ نگاہ اسکرین پر پڑی۔
ماہر فرید کا لنگ۔

ساری دنیا لمحے بھر کے لیے رک سی گئی۔ حور کا بلک بلک کے رونا... فون کی مسلسل بجتنی گھنٹی... ماہی کے چلانے کی آواز (یا رکوئی مجھے میرا فون لادے۔ یا اس کو سائینٹ کر دے) ... اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

صرف تین الفاظ اسکرین پر جگہ گار ہے تھے۔
”ماہر فرید کا لنگ.....“

”کیا مصیبت ہے۔“ ماہی اکتائی ہوئی سی پچن تک آئی۔ پھر مالا کو دیکھ کے اس کے تاثرات بد لے۔ وہ فون ہاتھ میں لیے شل سی کھڑی تھی۔ ماہ بینہ میں کاماتھا ٹھنکا۔

”کس کا فون ہے؟“

مالا نے آنکھیں اٹھائیں تو اس کی نظروں میں کچھ تھا۔ کچھ ایسا جو ماہی نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کچھ کہے
بنا اسکرین سامنے کی۔

ماہی کے ماتھے سے شکنیں غائب ہوئیں۔ سانس رک سا گیا۔

”اس کا نمبر تمہارے فون میں کیوں ہے؟“ وہ آنکھوں میں بے یقینی لیے پوچھ رہی تھی۔
ماہی نے تیزی سے اس کے ہاتھ سے فون لیا اور زور سے کال کائی۔

”ماہی میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔“

”کیوں پوچھ رہی ہو؟“ وہ ایک دم چٹ کے بولی۔ ”میں آزاد انسان ہوں۔ مجھے کسی سے بات کرنے کے لیے

تمہاری اجازت نہیں چاہیے۔“

وہ چند لمحے کے لیے کچھ بول نہیں سکی۔ چہرے پر بس ایک ششد رسا تاثر قم تھا۔

”تم اس سے رابطے میں ہو؟“

”اگر ہوں تو... تو اس میں کیا غلط ہے؟“ وہ قدرے پھیکی پڑی لیکن لبھ کی تیزی برقرار رہی۔

مالا کے تاثرات شاک سے دکھ میں بدلتے گئے۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم اس آدمی یا اس کے خاندان سے دور رہو گی۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا۔ (سینے پر انگلی سے دستک دی۔) میرا ریستوران مجھ سے چھینا۔ میں نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ اور میری بہن اس سے رابطے میں ہے۔“

وہ بے یقینی سے ماہی کو دیکھتے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹی۔

”یہ وفاداری ہے تمہاری میرے ساتھ؟“ ملامتی نظریں اس پر جمائے سرفی میں ہلا کیا اور تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ ماہی نے اسے پکارنے کے لیے لب کھولے، لیکن پھر زور سے پیر پچنا۔

”اُف... اب کیا کرو؟“ اس نے پریشانی سے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”سب کچھ خراب ہو گیا۔ اُف۔“

حور کے رو نے کی آواز سنائی دی تو وہ ایک غصیلی نظر فون پر ڈال کے اس طرف بھاگی۔

(اس کمخت کوتو میں بعد میں پوچھوں گی۔ کہاں اتنے دن سے رابطہ نہیں کیا۔ اور کہاں بن بتائے کاں کری۔) وہ باہر نکلی تو نومبر کی سرد ہواناک سے لکرائی۔ اس نے جیکٹ نہیں پہنی تھی کہ ابھی اتنی سردی نہیں تھی۔ اور ماہی سے بات کر کے ویسے ہی جسم ابل رہا تھا۔

زیاد ڈرائیور گ سیٹ پر بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو چہرہ تمثیل رہا تھا اور آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔

”آپ کو بہت زحمت دی میں نے۔“ رسمًا کہتے ہوئے وہ سر جھکائے سیٹ بیٹ باندھنے لگی۔

”نہیں میں لج بریک تک فارغ تھا اور....“ زیاد نے مسکرا کے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو چونکا۔

”آپ بھیک ہیں؟“ تشویش سے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تھے۔

”ماں یاد آرہی ہیں؟“ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے باہر دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

”آپ اگر یوں اپ سیٹ ہوں گی تو آپ کے بہن بھائیوں کو ہمت کون دلائے گا۔ آپ تو اتنی بہادر ہیں کہ....“

”میں کیوں بنوں بہادر؟“ وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔ ”سب کہتے ہیں تم بہادر ہو۔ کوئی مجھ سے کیوں نہیں پوچھتا کہ میں بہادر بننا چاہتی بھی ہوں یا نہیں؟“ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

”ماں کی بیماری پہ سب نے کہا ... تم بڑی بہن ہو۔ تمہیں سب کو جوڑ کے رکھنا ہے۔ یہی کہا تھا سب نے جب میرے ابو کی ڈین تھوڑی ہوتی تھی۔ کشمائلہ تم بڑی ہو۔ تم نے سب کو سنجاانا ہے۔ کیوں؟ میں نے اپنے لیے بڑی بہن کا روں نہیں چنا تھا۔ کوئی اپنی مرضی سے بڑا نہیں بنتا۔ سب ہمیں زبردستی بہادر بناتے ہیں۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بھیگی آنکھوں سے کھڑ رہی تھی۔

وہ تحمل سے اسے سن رہا تھا۔

”معید صرف اپنا سوچ رہا ہے۔ لڑکا ہے نا۔ جہاں دل چاہا منہ اٹھا کے چلا گیا۔ اور ماہی....“ اس کا لہجہ رندھنے لگا۔ ”جب ذمہ داری کی بات ہوتی ہو تو میں بڑی بہن بن جاتی ہوں۔ لیکن جب میری بات کامان رکھنے کا معاملہ ہو تو وہ اپنی مرضی کرتی ہے۔ سب یہاں اپنی مرضی کرتے ہیں۔“ اس نے ناک سے گیلی سانس اندر کھینچی۔

”لڑکی ہوتی ہے بہن سے؟“

”یہ دونوں سب فیصلے اپنی بہتری سوچ کے لیتے ہیں۔ میری نہیں۔ میں ان کے لیے کیا کیا کرتی ہوں، کسی کو احساس نہیں ہے۔“

بول بول کے اس کا گالاخنگ ہونے لگا۔ آنسو لڑک کے گال پہ گلے پمپل اسٹکر کو بھگونے لگے۔

”وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ صرف کوئی غلط فہمی ہوگی جو جلد دور ہو جائے گی۔“

وہ نرمی سے کھڑ رہا تھا۔ وہ چند لمحے گھرے سانس لیتی رہی۔ پھر ٹشو سے آنکھیں صاف کیں۔

”سوری میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔“ اب جا کے احساس ہوا۔

”آپ چاہیں تو ہم پھر کسی دن بھی جاسکتے ہیں۔“ اس نے فراخ دلی سے پیشکش کی لیکن کشمائلہ نے سختی سے سرفی میں ہلا کیا۔

”نہیں۔ مجھے اور درینہیں کرنی۔ میں تنگ آگئی ہوں ان ان دیکھی چیزوں سے۔ مجھے جلد از جلد اس سب سے نکلنا ہے۔ اور شکور میر او احد کلیو ہے۔“

زیاد نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کارر یورس کرنے لگا۔

(ہر کچھ دن بعد ماہر فرید کا ایک نیا کار نامہ معلوم ہوتا ہے۔) وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے الجھی الجھی سی سوچ رہی تھی۔ (اسے توفن آتا ہے ذہنوں کو manipulate کرنے کا۔ نہ جانے ماہی سے کیا کہتا ہو گا اور وہ اس کی باتوں پر یقین کر لیتی ہو گی۔ اف۔)



اسکول بلڈنگ سرخ اینٹوں سے بنی تھی اور اس کے چاروں اطراف میں سر بزر کھلے لان تھے۔ سرد ہوا سے اس کی اوپنی پونی دائیں باہمیں جھوول رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ زیاد کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی ساعت کام نہیں کر رہی تھی۔ ذہن میں بہت سا شور تھا۔ اور زگا ہوں کے سامنے بہت سے مناظر کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔

دفعتا وہ چلتے چلتے رکی۔ اردو گردا اسکول یونیفارم میں لڑکیاں چلی جا رہی تھیں۔ وہ رک کے ایک اوپنی پونی والی لڑکی کو دیکھنے لگی جو ساتھ سے گزر کے لان کی طرف جا رہی تھی۔ وہ مڑی تو کشمالة بھی مڑ کے اسے دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کا دانوں سے بھرا چہرہ جھکا تھا اور ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جسے لیے وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ اس سے چند قدم آگے ایک سفاری سوٹ میں ملبوس صاحب چل رہے تھے۔
”سرستار....“ لڑکی نے جھکتے ہوئے پکارا۔

وہ رک کے۔ اور اس کی طرف پلٹے۔ کمرپہ ہاتھ باندھے وہ موچھوں اور بارعب چہرے والے استاد تھے۔
”سر میں آپ کو کچھ دکھائی ہوں؟“، کم عمر لڑکی کی بلکی سی آواز سنائی دی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا یا تو اس نے جلدی سے کاغذان کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ میں نے بنایا ہے۔“ امید سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے خشک لبوں پر زبان پھیری۔
انہوں نے کاغذ تھاما اور اسے اوپنچا کیا۔ اس پر سرخ اینٹوں والی عمارت بنی تھی۔ ستار صاحب نے نگاہ اٹھا کے سامنے نظر آتی اسکول کی عمارت کو دیکھا۔ پھر واپس کاغذ کو۔ وہ ہو، ہو اس کا عکس تھی۔
اب کے انہوں نے اس کم عمر لڑکی کو دیکھا جو سانس روکے ان کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کے مڈر میں چند ہفتے رہ گئے ہیں، کشمالة۔ اگر آپ اپنا قیمتی وقت ان بے کار پیننگز میں لگائیں گی تو امتحان کی تیاری کون کرے گا۔ یہ فارغ دنوں میں کرنے والے کام ہوتے ہیں۔“ سختی سے کہہ کے کاغذ واپس

تھا۔ اس کے چہرے کی جوت بجھ گئی۔ سفاری سوٹ والے صاحب آگے بڑھ گئے۔ وہ سر جھکائے وہیں کھڑی رہ گئی۔

”کشمائلہ.....“ وہ اس کے قریب بولا تو وہ چونکی۔ منظر فضائی میں تحلیل ہو گیا۔ اس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں تنہا اسکول کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔

”آپ کو اپنا اسکول پسند تھا؟“ وہ راہداری میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے جب زیاد نے پوچھا۔

”کسی کو اپنا اسکول دل سے پسند نہیں ہوتا، زیاد۔ ہر اسکول کے ساتھ تکلیف دیا دیں جڑی ہوتی ہیں۔“

”کیسی تکلیف؟ آپ تو ہمیشہ سے اچھی اسٹوڈنٹ رہی ہیں۔“ زیاد نے تعجب سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے دراز قد تھا۔ اس کے کندھے کے برابر چلتے ہوئے بھی مالا کو چہرہ اٹھا کے اسے دیکھنا پڑتا تھا۔

”تکلیف گریڈز سے نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کے رویے سے ہوتی ہے جن کے ہاتھوں میں والدین اپنے بچے دیتے ہیں تاکہ وہ ان کی شخصیت سازی کریں۔ لیکن....“ ایک تلخ مسکراہٹ چہرے پر درآئی۔ ”ان میں سے اکثر استادوں کو خود تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ بچے کی کچھ شخصیت کو کیسے ڈھج کر رہے ہیں۔“

”استاد ایک کم تخلواہ دار طبقہ ہوتا ہے۔ اپنے گھر کی فروٹریشن، اپنی محروم زندگی کا غصہ کسی پر تو نکالنا ہوتا ہے انہیں۔“

مگر اس نے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”کوئی بھی چیز ایسے استاد کو جستافائی نہیں کر سکتی جو چالیس پچاس سال کی عمر میں ایک ٹین اتنے بچے سے مقابلے کرے اور مہربانی سے پیش نہ آئے۔“

کاریڈور میں کچھ اسٹوڈنٹس بھی آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں کسی کونے سے کھلکھلاہٹ گونجی۔ کہیں سے سرگوشی۔ وہ پلٹ کے نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن وہ منظر کسی سیاہ دھونیں کی طرح اس پاس چھانے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا وجود اس کے اندر ہر طرف سے گھر گیا۔

سامنے ایک خالی کلاس روم بنا تھا جس میں ایک سرمنی سفاری سوٹ والے صاحب کرتی پر بیٹھے تھے۔ وہ چند کاغذات الٹ پلٹ کر رہے تھے جب دو چھکنے کے قدم ان کی طرف آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے چونک کے سر اٹھایا۔

”سر ... یہ مرائد مرمز کا رزلٹ ہے۔“ اس نے ہلکی آواز میں کہتے ہوئے ایک کارڈ انہیں تھما۔ انہوں نے ایک

نظر اسے دیکھا اور دوسری نظر کارڈ پڑا۔ پھر ہاتھ بڑھا کے کارڈ تھام۔ ان کی کلامی میں ایک چمکتی ہوئی شہری گھڑی تھی جس پر نخے ہیرے جڑے تھے۔ وہ بنا پلک جھپکے ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”95%؟ چیز....“ انہوں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”آپ جیسی اسٹوڈنٹ کے 98% سے کم نہیں آنے چاہیے تھے۔ آپ اس سے زیادہ محنت کر سکتی تھیں۔“ اور مصروف سے انداز میں کارڈ واپس تھما دیا۔ اس کے چمکتے چہرے پر کچھ بجھ سا گیا۔

”اگلی دفعہ زیادہ محنت کرنا۔“ اس نے سرا ثبات میں ہلاتے ہوئے کارڈ کمر کے پیچھے کر لیا۔ ہاتھوں میں بلکل سی کمپکا ہٹ تھی۔

”سب کو ایسے ہی استاد ملتے ہیں، کشمائلہ۔“ اس کی آواز اسے واپس حال میں سمجھنے کے لائی۔ وہ دونوں خالی کارڈیوں میں کھڑے تھے اور زیادہ کھدڑہ ہاتھا۔

”لیکن کچھ لوگ ایسے ٹاکمک استادوں کے باوجود شخصیت پر کوئی دھبہ لیے بغیر زندگی میں آگے نکل جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا یا شاید خود سے۔

”کیونکہ وہ ہماری طرح اس استاد میں کسی اور کوئی نہیں تلاش کر رہے ہوتے۔“ وہ سرگوشی میں بولی تھی۔ زیاد نے چونک کے اسے دیکھا۔ مگر وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کا رخ ایک آفس کی جانب سے تھا۔

”شکور کو اس سکول سے گئے کئی برس بیت چکے ہیں۔“ وہ دونوں ایک آفس میں بیٹھے تھے۔ دو لکڑی کی کرسیوں پر ساتھ ساتھ۔ میز کے اس پار عینک لگائے بیٹھی تھیں۔ ان کے پیچے بک شیلف اور اوپن کپنٹس میں فائلز رکھی نظر آرہی تھیں۔

”آپ کو معلوم ہے وہ اب کہاں ہو گا؟“

چائے کے کپ آئے رکھے تھے۔ لیکن ان دونوں نے ان کو نہیں چھوڑا تھا۔

”میرے پاس اس کے گھر کا پرانا پتہ ہے۔ معلوم نہیں وہ وہاں ہو گایا نہیں۔“ وہ چند کاغذات ادھرا دھر کرنے لگیں۔ پھر عینک کے پیچے سے انہیں دیکھا۔ ”ابھی ڈھونڈنا مشکل ہو گا۔“ میں آپ کو بعد میں معلوم کر کے میمیج کر دوں گی۔“

انہوں نے فال بند کی اور پھر باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔

”آپ نے جب کال کی تو میں نے مس شرین سے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ

اسی اسکول سے پڑھی ہیں اور اب اسلام آباد میں ایک کامیاب ریستوران چلا رہی ہیں۔ ہمارے اسکول کو آپ جیسے اسٹوڈنٹس پر بہت فخر ہے۔“

”اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میری کامیابی میں میرے اسکول کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔“ وہ سمجھیدہ نظر آرہی تھی۔ ان کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آنکھوں میں ناسجھی ابھری۔

”شکور نے جا ب کیوں چھوڑی تھی؟“ زیاد نے جلدی سے بات سنچالی۔ وہ جو اس کی بات پر سوچنے لگ گئی تھیں، اب کے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

”اس نے ستار صاحب کی ڈائمنڈ و اچ چرائی تھی۔ اسی لیے اسے جا ب سے نکالا گیا تھا۔“
”ستار صاحب کون؟“

”اسکول کے پرنسپل۔“ جواب مالا کی طرف سے آیا۔ اس کے لمحے میں بہت سے گلے تھے۔
”بہت ہی قابل استاد تھے وہ۔“ خاتون کے چہرے پر فخر یہ مسکراہٹ درآئی۔

”انہتائی غیر مہربان اور...“ وہ جوتیزی سے کہنے لگی تھی، اپنے جوتے سے اس کا جوتا تکرانے پر خاموش ہو گئی۔
زیاد نے اس پر ایک تنپیہن نظر ڈالی اور پھر واپس خاتون کی طرف متوجہ ہوا۔
”یعنی شکور ایک چور تھا؟“

”بہت پرانی بات ہے۔ اب ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ ویسے وہ ایماندار آدمی تھا۔ شاید ستر سارے غصے میں تھے۔“
انہوں نے بے پرواہی سے شانے اچکائے۔ ان کے انداز میں اب کشمائلہ کے لیے ناپسندیدگی سی تھی۔ ”میں ایڈر لیس ڈھونڈ کر تیج کر دوں گی۔“

”آج آپ کا مود کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔“ واپسی پر کاریڈور میں چلتے ہوئے زیاد سلطان کھنکھارا۔ وہ خاموشی سے سینے پر بازو لپیٹی آگے بڑھتی گئی۔

”میں آپ کو اس لیے ٹوک رہا تھا کیونکہ اس روئے پر وہ ہمیں کبھی بھی شکور کا ایڈر لیس نہیں دیں گی۔“ وہ نرمی سے کہنے لگا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔

”ویسے شکور کیسا آدمی تھا؟ کیا واقعی اس نے چوری کی تھی یا الزام لگا تھا؟“ کچھ دیر بعد زیاد نے بات کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

”الزام لگا تھا۔“

”آپ کو کیسے معلوم؟“ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔
کشمائلہ کے قدم تھے۔ پھر وہ گہری سانس لے کر زیاد کی طرف پہنچنے تو اس کی آنکھوں میں جواب کے ساتھ اور بھی بہت کچھ تھا۔

”کیونکہ میں اس الزام کا حصہ تھی۔ اس کی جانب جانے اور اس کی زندگی خراب کرنے والوں میں ایک میں بھی تھی۔“

وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکا۔

”ناممکن۔“ زیاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ ایسا کچھ نہیں کر سکتیں۔“

”اپنا اسکول کسی کو دل سے پسند نہیں ہوتا“ زیاد۔ کیونکہ اس کے ساتھ تکلیف دہیا دیس جڑی ہوتی ہیں۔“
وہ اداستی سے مسکرائی اور وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ اتنبول کی ایک سرداشام تھی۔ چنگیز ہسپتال کی عمارت میں داخل ہوا تو اس نے جیکٹ پہن رکھی تھی اور سردی سے ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ مطلوبہ فلور پہ جیسے ہی لفت سے اتر اسامنے روم ۵۵۵ کے باہر صوف پہ تھا بیٹھا پیر بل نظر آیا۔ اس کے تاثرات بگڑے بگڑے سے تھے۔

”یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر آدھے شہر کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔“ وہ تعجب سے اسے دیکھتا قریب آیا تو پیر بل نے ایک ناراض نظر اس پہ ڈالی۔

”پھول اکٹھے کرتے کرتے تھک گیا تھا۔“

”کیسے پھول؟“

”وہی جو مہربے کے منہ سے جھٹر رہے ہیں۔“ ساتھ ہی ابرو سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔
چنگیز سر جھٹک کے آگے بڑھ گیا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا وہ تار آج بھی راستے میں تھی۔ اسے احتیاط سے عبور کیا اور اندر آیا۔

پہلے سٹنگ روم بناتھا جس کی میز پھولوں سے بھر چکی تھی۔ آگے کمرے کا دوسرا حصہ تھا جس پہ ماہر کا بیڈ رکھا تھا۔ ساتھ کاؤنچ پر زارا بیٹھی تھی۔ پچھے کھڑکی کے بلا سندھ بیٹھے تھے اور ایک نیکاؤں شام پھیلی دکھائی دیتی تھی۔ یہ ہسپتال کے کمرے سے زیادہ ہوٹل سوئیٹ لگتا تھا۔

ماہر بیڈ پر ہانوں سے نیک لگائے تالگیں لمبی کیے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک لانگ ہنوز پلسترا اور پیوں میں جکڑی تھی۔ چہرے پر زمانے بھر کی بے زاری اور ماتھے پر بل تھے۔ ایک طرف شبنم کھڑی تھی اور دوسری طرف کاؤچ پر بیٹھی زارانہ میں سے کہہ رہی تھی۔

”یہ ممکن نہیں ہے، ماہر۔ تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا ہو گا۔“

چنگیز خاموشی سے قدم اٹھاتا بیڈ کی پائینتی تک آ رکا۔ بیربل بھی اس کے پیچھے تھا۔

”میں تمام کام مکمل ذمہ داری سے سنبھال رہی ہوں۔“

”پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ ابرو اکٹھے کیے رہی سے بولا۔ چنگیز نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ چڑھا اسے لگ رہا تھا۔ بال ماتھے پر بکھرے تھے اور چہرے کے نیل اب بھورے ہو چکے تھے۔

”میں آفس سے واپسی پر تمہاری خیریت معلوم کرنے آئی ہوں۔“ زارا نے بدقت لجھ کی نرمی برقرار کھی۔ پھر اسے نووار دکی موجودگی کا احساس ہوا تو نظریں موڑیں۔ پائیتی کے ساتھ کھڑے چنگیز کو دیکھا جس نے عامتی شرط پہن رکھی تھی اور گردن میں پولیس ہجھ چین کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی پھیلی۔ ہلاک سا کھنکھاری۔

”کمرے میں اتنا رش نہیں ہونا چاہیے۔“

”بالکل، زارا۔ تم چلی کیوں نہیں جاتیں؟“

بیربل مسکرا کے بولا تو زارا کے ماتھے پر بل پڑے۔ وہ پرس اور سفید کوٹ اٹھا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک آخری نظر ماہر پر ڈالی۔

”تمہاری غیر موجودگی میں کیف میری ذمہ داری ہے۔ او کے؟ بھروسہ کرو مجھ پر۔“ مسکرا کے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ ان دونوں نے ایک طرف ہٹ کے اسے راستہ دیا۔ وہ ایک گھورتی نظر ان پر ڈال کے آگے بڑھ گئی۔ بیربل نے گردن موڑ کے اسے جاتے دیکھا اور پھر چوکٹ پر رکھی تار کو۔ زارا نے احتیاط سے اپنے لانگ بوٹس سے اس کو عبور کیا اور باہر نکل گئی۔ بیربل کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

”تم اپنے ڈیوٹی آورز میں یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ماہر فرید کی توجہ کامرز اب چنگیز تھا۔

”تمہاری خیریت پوچھنے آیا ہوں۔“

”فون پر پوچھ سکتے تھے۔ آنے کی کیا ضرورت تھی؟ گورنمنٹ تمہیں ہر گھنٹے کی تاخواہ دیتی ہے۔“ اسی خراب مود

سے کہہ کے اس نے سر جھکا۔

”یہ ہے تمہارے حصے کے پھول۔“ بیربل نے مسکرا کے اس کے کان کے قریب سر گوشی کی۔

”اور تمہیں کچھ کہا ہے میں نے۔“ وہاب شبنم سے مخاطب تھا جو بیڈ کے دوسری جانب کھڑی تھی۔

شبنم نے ایک نظر بیربل کو دیکھا (جس نے خفیف انداز میں گردن دائیں سے باٹیں ہلائی۔) پھر واپس ماہر کو۔

”میں آپ کی بات نہیں مان سکتی۔“

ماہر چند لمحے سے گھورتا رہا۔

”جانتی ہونئی سیکرری ڈھونڈنے میں کتنی دریگتی ہے؟“

”اس کے لیے پہلے ہسپتال سے ڈپارچ ہونا ضروری ہے۔“ شبنم نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔

”مسئلہ کیا ہے؟ ماہر کو کیا چاہیے؟“ اب کے چنگیز اکتا سا گیا تھا۔

”ماہر اپنا لیپ ٹاپ اور گرافیٹی مانگ رہا ہے کیونکہ اسے کام کرنا ہے۔“ بیربل گھری سانس لے کر بتانے لگا۔ ”اور ہم اتنی دیر سے ماہر کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ ڈاکٹر نے ان کو مکمل ریسٹ کا کہا ہے۔ کام کرنا ان کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔“

”اور ماہر بے ہماری اور ڈاکٹر کی بات نہیں مان رہے۔“ شبنم نے بسی سے چنگیز کو دیکھا۔ ”آپ ان کو کچھ سمجھائیں؟“

”لڑکی تم ماہر کے لیے کام کرتی ہو یا ڈاکٹر کے لیے؟“ وہ جواب اسے گھور کے کہنے لگا تو شبنم نے ناسجھی سے اسے دیکھا۔ بیربل بھی چونکا۔

”میرا دوست تمہیں کہہ رہا ہے کہ اس کا لیپ ٹاپ چاہیے اور تم آگے سے انکار کر رہی ہو؟“

پہلی دفعہ ماہر کے ماتھے کے بل کم ہوئے۔ اس نے قدرے آرام دہ انداز میں پیچھے تکیے پر سر کا دیا۔

”چنگیز کیا کہہ رہے ہو....“ بیربل نے اس کی کہنی ہلائی لیکن وہ شبنم سے مخاطب تھا۔

”تم انہی قدموں پر آفس واپس جاؤ اور جو وہ مانگ رہا ہے اسے لا کر دو۔ یا میں پولیس اسٹیشن سے کچھ بندے بھیجوں؟“

”اوے۔“ شبنم کا چہرہ اتر گیا۔ چنگیز کو کینہ پر نظروں سے گھورتے ہوئے واپس مڑ گئی۔

”تم اس کے دوست ہو یا شمن؟“ بیربل اس پر خفا ہوا۔ ”اس کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے کہ....“

(پس منظر میں شبنم کے آوچ کی آواز سنائی دی لیکن اب وہ دونوں متوجہ نہیں تھے۔)

”اس کی ٹانگ لٹوٹی ہے۔ ہاتھ سلامت ہیں اور دماغ بھی۔ وہ کام کرنا چاہتا ہے، کوئی نیا ڈریزاں بنانا چاہتا ہے تو تم لوگ کون ہواں کوروں کرنے والے؟“

”وہ بیمار ہے چنگیز۔ وہ کیسے....؟“

وہ جو خاموشی سے ان کی بحث دیکھ رہا تھا، اب کے بے زاری سے مداخلت کی۔

”اپنے مسئلے باہر جا کے حل کرو۔“ دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پیشانی پہ بل اور چہرے پہ شدید اکتا ہٹ تھی۔

”جاو۔“ دوبارہ بلند آواز سے کہا تو وہ دونوں فوراً دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

”تم کس کی سایہ پہ ہو؟“ باہر آتے ہی بیربل بگڑ کے بولا۔

”چپ چاپ وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہیں اس کی وجہ بعد میں بتاؤں گا۔“ اس نے بیربل کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے دبایا تو اس نے اکتا کے اپنا کندھا چھڑایا۔

”میں تمہیں ابھی اسی وقت عاق کرتا ہوں۔“

چنگیز دھیرے سے نہس دیا اور وہ خفگی سے بڑا تباہ ہوا صوفے پر دھپ سے بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وہ گھر واپس آئی تو مبین منزل میں خاموشی تھی۔ حرسو چکی تھی اور ماہی لاوچ میں آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ بخت بی اس کے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں۔ آہٹ پہ آنکھیں کھولیں تو دیکھا، مالا اسے دیکھے بنا سیدھی اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ ماہی کے چہرے پہ ڈھیر سارا ملال اتر آیا۔

”مالا مجھ سے ناراض ہے، بخت بی۔“

”بہن بھائیوں کی ناراضیاں ختم ہو جاتی ہیں ماہ بی بی۔ تم چھوٹی ہو تم معافی مانگ لو۔“

”لیکن میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

”پھر بھی معافی مانگ لو۔ بڑا بڑا ہوتا ہے اور چھوٹا چھوٹا۔ تمہارے کنیڈا میں شاید سکھاتے ہوں کہ بڑا چھوٹا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن ہوتا ہے۔“ وہ اب اس کے سر پر زور زور سے مالش کر رہی تھی۔ ماہی چپ چاپ بیٹھی رہی۔

بخت بی نے اس کے چھوٹے بالوں کو بمشکل فرنچ چوٹی میں باندھا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ موبائل اٹھا کے عباد کو

کال کرنے لگی تو احساس ہوا کہ بالوں کی چکنائی ہاتھوں سے ہوتی ہوئی اسکرین پر لگ گئی ہے۔ لیکن اس وقت اسے پرواہ نہ تھی۔

موباکل کان سے لگایا اور باہر لان میں چلی آئی۔ وہاں شام اتر رہی تھی اور ٹھنڈہ بڑھ گئی تھی۔

اسے جاتے دیکھ کے بخت بی نے بے اختیار سر کو ہاتھ مارا۔

”کتنا منع کیا تھا، شام کو تیل نہیں لگاتے۔ اوپر سے بی بی باہر چلی گئی ہے۔ ٹھنڈا لگ جائے گی۔“، لیکن سامنے بھی ماہی تھی۔ اسے اپنی مرضی کرنی ہوتی تھی۔

”یار ہماری ابھی صبح نہیں ہوئی۔“ عباد کی ناراض آواز فون میں گونجی۔

”لیکن تم اٹھنے ہوئے ہو نا۔ یہی کافی ہے۔“ پھر کھنکھاری۔

”ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”مسئلے کو فیڈ ردے دو۔ خود ہی سوجائے گی۔“

”عباد میں سیر نہیں ہوں۔“ وہ چلتی۔ پھر آواز دھیمی کی۔ ”مالا کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں ماہر فرید سے رابطہ میں تھی۔ اب وہ مجھ سے ناراض ہے۔ میں کیا کروں؟“

عباد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے تمہیں کہا تھا کہ اسے وقت سے بتا دیکھنے نہیں۔ ماہی کو اللہ تعالیٰ نے کان سننے کے لیے نہیں، ایک سے سن کے دوسرے سے نکال دینے کے لیے دیے ہیں۔“

”لیکن اس نے ناراضی میں مجھے بہت سخت بات کہی ہے۔ یہ کمیری اس کے ساتھ کوئی وفاداری نہیں ہے۔ ایسا کیا کیا ہے میں نے؟“ دبے دبے غصے سے کہتے ہوئے ایک نظر اس کھڑکی کی طرف ڈالی جو مala کے کمرے میں کھلتی تھی۔

وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

”مالا جب بھی لڑتی ہے یہی کہتی ہے۔ کہ وہ ہمارے لیے سب کچھ کرتی ہے اور ہم صرف اپنا سوچتے ہیں۔ بڑی بہن ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے تو نہیں کہا تھا کہ بڑی بہن بنو۔ یہ تو قدرت کا کام ہے۔“

”تمہیں وہ وقت یاد ہے جب خالو یعنی تمہارے ابو کی ڈیتھ ہوئی تھی؟“ وہ سوچ سوچ کے کہنے لگا۔

”نہیں یار۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔“

”اور اسی لیے تمہیں وہ وقت نہیں یاد کیونکہ وہ بڑی بہن تھی۔ تم نہیں۔ مالا کو وہ سب یاد ہو گا جیسے مجھے یاد ہے۔“

”ابو کہاں سے آگئے درمیان میں؟ ماں نے ہمیں ماں اور باپ دونوں بن کے پالا ہے۔ وہ بے زار ہوئی۔

”کوئی ماں باپ نہیں بن سکتی ہے۔ نہ کوئی باپ ماں بن سکتا ہے۔ پیرنس ایک دوسرے کی کمی چاہ کے بھی پوری نہیں کر سکتے۔“

(کشمائلہ اندر داخل ہوئی تو کمرہ گرم تھا۔ وہ تیزی سے کاؤچ تک آئی جہاں کمبل پر فاختہ لیٹھی تھی۔ وہ بچوں کے بل اس کے سامنے نہیں۔)

”جن بچوں کے باپ جلدی مر جاتے ہیں ان میں بہت سی کمیاں رہ جاتی ہیں۔ بالخصوص بڑے بچے میں۔“

”مالا میں کوئی کمی نہیں ہے، عباد۔ وہ groomed ہے۔ کافیڈنٹ ہے۔ مala پرفیکٹ ہے یا۔“

(اس نے نرمی سے فاختہ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ وہ بالکل ٹھنڈی تھی۔ کشمائلہ کی سبز آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔)

”نہیں ماہی۔ ایسے بچے بڑے ہو کے پرفیکٹ نہیں بنتے۔ وہ fixer بن جاتے ہیں۔ جانتی ہو fixer کیا ہوتا ہے؟“

”نہیں۔“

(وہ نرمی سے اس بے جان ٹھنڈی فاختہ کے پروں پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ آنسو تو اتر سے آنکھوں سے گر رہے تھے۔)

”فکر وہ بڑے بچے ہوتے ہیں جنہیں بچپن سے یہ کہا جاتا ہے کہ انہیں بڑا بننا ہے۔ ذمہ دار بننا ہے اور اپنے سے چھوٹوں کو تکلیف سے بچانا ہے۔“

(اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور دھیرے دھیرے فاختہ کے بازو کی پٹی کھولنے لگی۔)

”ان کو دنیا والے کہتے ہیں کہ انہیں اب دوسروں کو خوش کر کے جینا ہے ورنہ خاندان میں ان کی بقا ممکن نہیں ہے۔ سوا یے بچے بچپن سے people pleasers people بن جاتے ہیں۔“

(پیٹ علیحدہ ہوئی تو اس نے دیکھا۔ اندر موجود خم سوکھ چکا تھا۔ اس نے فاختہ کو اپس لٹایا اور الماری تک آئی۔ اب وہ دراز کھولے کچھ تلاش کر رہی تھی۔)

”فکر یا people pleaser بچے ہر فادر figure میں اپنا باپ ڈھونڈتے ہیں۔ وہ اپنی ہر پسندیدہ

شخصیت کو خوش کرنا چاہتے ہیں جا ہے وہ انہیں کتنی ہی اذیت دیں۔“

(اس نے دراز سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے اندر ایک سلک کا بزرگ مال تھا۔)

”فلکر بچوں کے بڑے ان کی یہ کہہ کے حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ اچھے بچے ہیں۔ سمجھدار اور ذمہ دار ہیں۔ اور وہ بچے اس کو اپنا reward جان لیتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ ان کی قدر و منزالت ہر کسی کو فحکر کرنے سے بڑھتی جائے گی۔“

(وہ اب دھیرے دھیرے فاختہ کو بزرگ مال میں پیش رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک گیلی تھیں۔)

”ایسے لوگوں کی بچپن سے کوئی boundaries (حدود) نہیں ہوتیں۔ وہ اسکول میں bully ہونے کے باوجود اپنے لیے آواز نہیں اٹھانا چاہتے کیونکہ وہ conflicts سے ڈرتے ہیں۔ انہیں اچھے بچے کا خطاب ہر وقت چاہیے ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ کسی کو ناراض نہیں کر سکتے۔ اذیت دینے والے انسان کو بھی نہیں۔“

(وہ بزرگ مال کی نئی سی گھنٹی کو تھامے گھر کے پچھلے چمن میں آئی جہاں ایک کچن گارڈن بنا تھا جو عدم تو جہی کے باعث سوکھ چکا تھا۔ وہ بچوں کے بل وہاں بیٹھی اور سلوک کے چیਜ سے مٹی کھو دا شروع کی۔)

”ایسے بچے کو ذرا سی ناکامی پہنچی یہ ڈر ہوتا ہے کہ اس سے پیار اور توجہ چمن جائے گی۔ اسی لیے وہ اپنے ساتھ بے تحاشا کامیابوں کے تمغے لگانا چاہتے ہیں تا کہ انہیں سی بڑیے کا پروول ہمیشہ ملتا رہے۔“

(کچن گارڈن پہ جانی سی شام اتر رہی تھی۔ چیج سے زم مٹی میں کھو دا جانے والا گڑھا اب کافی گہرا ہو چکا تھا۔ اس نے رک کے سانس لیا اور پھر رہا میں لپٹے پرندے کو اٹھایا۔)

”ہمیشہ سمجھدار بننے رہنے کی چاہ ان بچوں کو بہت ٹھنڈے مزاج کا بنادیتی ہے۔ ان میں بہت برداشت ہوتی ہے۔ وہ مہربان ہوتے ہیں۔ اپنی پرواہ نہیں کرتے۔ اور خود کو نظر انداز کر کے اپنے سے چھوٹوں کی حفاظت میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ان کے لیے ہمیشہ لڑتے ہیں۔ لیکن اپنے لیے نہیں۔“

(اس نے احتیاط سے فاختہ کو رہا میں سمیت گڑھے میں ڈالا۔ پھر ایک ٹھنڈی اور گہری سانس خارج کی۔ لبوں سے دھواں سانکلا۔ اب وہ باتوں سے مٹی اس پہ ڈالنے لگی۔)

”مالا ہمیشہ سے ایک فلکر رہی ہے۔ معید پڑھائی میں اچھا نہیں تھا۔ وہ کبھی اس کے ٹیچرز کے پاس جاتی تو کبھی ٹیوشن اکیڈمی۔ وہ سب کو مجبور کرتی تھی کہ وہ معید کو توجہ دیں۔ اور رہی تم۔ تو بچپن سے اب تک تمہاری لڑائیاں ختم نہیں ہوتی تھیں۔“

ماہی کی آنکھیں جھک گئیں۔

”کبھی تم کسی کا سر پھاڑ آتی تھیں۔ کبھی کسی کلاس فیلو کی چوٹی کاٹ دیتی تھیں۔ وہ تمہاری ہر لڑائی میں تمہیں بچانے ساتھ گھڑی ہوتی تھی۔“

”لیکن عباد.. ہمارے ہاں سارے بڑے بہن بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

”نہیں ہونا چاہیے ایسے ماہی۔ ہمیں کسی بڑے بہن بھائی کو نہیں سکھانا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو نظر انداز کر کے دوسراے کا خیال رکھے۔ یہ چیز انسان کو بڑے ہو کے ڈھج کر دیتی ہے۔ انسان کو سب سے اوپر اپنا آپ رکھنا ہوتا ہے۔“

”یہ خود غرضی نہیں ہوگی؟“

”نہیں۔ اسے خود سے محبت کہتے ہیں۔ اور مالا کو خود سے محبت نہیں ہے۔ وہ دوسروں کو فحکر نہیں کرنے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور وہ اپنی طرف آئی ہرنا کامی کو قبول کر کے اپنے حق سے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ تمہارے خیال میں وہ ظہیر سے کیوں نہیں لڑی؟ شکست قبول کر کے اسلام آباد چھوڑ کیوں آئی؟“

ماہی خاموش رہی۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔

”کیونکہ اندر سے مالا کو ہمیشہ سے معلوم تھا کہ ظہیر ایک دن یہ کرے گا۔ مالا میری کزن ہے اور میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ اسے ڈرتھا کہ اگر اس نے ظہیر سے بحث کی تو وہ اسے کوئی نئی آفردے دے گا۔ اور وہ ایک دفعہ پھر اس کی باتوں میں آجائے گی۔ اس لیے خود کو مزید ہرث سے بچانے کے لیے اس نے جگہ چھوڑ دی۔“

”اسی لیے اس نے ماہر کی کوئی بات نہیں سنی۔“

”نہیں کیونکہ اسے ڈر ہے کہ وہ دوبارہ اس پہ بھروسہ کرے گی اور وہ پھر سے اسے ڈھوکہ دے گا۔ فلسر اور people pleaser بچوں کو ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ لوگ ان سے ان کی ذات کے لیے محبت کریں۔ انہیں اپنے ساتھ تنگ لگانے ہوتے ہیں۔ کامیابیاں۔ تاکہ دوسراے ان کو کسی قابل سمجھیں۔“

”اور جب انہیں کوئی چوٹ لگے؟“

”تب وہ اپنے گرد کھڑی دیواریں مزید اوپنجی کر دیتے ہیں تاکہ کوئی ان کو پچلانگ نہ سکے۔ بظاہر وہ سب کے دوست ہوتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو ناراض نہیں کرتے۔ جیسے مالا کا سو شرکل بہت وسیع ہے۔ ذرا کوئی مسئلہ ہو تو اس کا کوئی یونیورسٹی فیلو کہیں سے نکل آتا ہے۔ لیکن اصل میں ایسے بچے ہمیشہ سے اکیلے ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی دوست

نہیں ہوتا۔“

”میری زندگی میں بھی باپ کی کمی ہے۔ لیکن میں ایسی نہیں ہوں۔“

”کیونکہ تمہارے ساتھ ہمیشہ تمہاری بڑی بہن کھڑی تھی۔ ماں معید ملا۔ سب نے تمہیں محبت دی۔ لیکن تم نے کبھی سوچا کہ تمہارا شدید غصہ اور جذباتی پن دراصل اندر سے کسی نفیاتی....“

”ایک منٹ ایک منٹ ماہر نفیات....“ اس کے توسر پلگی، ”تلود پہ بھی۔“ تم اپنا تجزیہ اپنے پاس رکھو۔ اور جا ب پہ جانے کی تیاری کرو۔“ کھٹ سے فون رکھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”نکالتی ہوں میں اس کی ساری نفیات کی کتنا بیس گھر سے۔“

پھر گردن موڑ کے ملا کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھا۔ اور ایک گھری سانس خارج کی۔ عبا درست کہتا تھا۔ ان بہنوں کا تعلق کسی کم بخت کی وجہ سے خراب نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اس نے دھیرے سے دروازے پہ دستک دی۔ جواب نہیں آیا تو ماہی نے دروازہ دھکیلا۔ وہ کمرے کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بازوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹئے وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ کاؤنٹ خالی تھا۔ فاختہ اب وہاں نہیں تھی۔

”ملا....“

وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے ساتھ بیڈ کی پائیتی پہ بیٹھی۔

”تمہیں وہ امیر آدمی یاد ہے جس نے ایک دفعہ وہاں ایئر پورٹ پر مجھے لکٹ لے کر دیا تھا....“

”وہ ماہر فرید تھا۔ ہے نا؟“ وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی تو ماہی کے لب کھل گئی۔ لمحہ بھر کے لیے وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”تم گز شترے چند ہفتوں میں کئی بار اس آدمی کا ذکر کرتے کرتے چپ ہو جاتی تھیں۔ دیر سے سہی لیکن آج جب بیٹھ کے سوچا تو مجھے سمجھ میں آگیا کہ تم اس کو کیسے جانتی ہوگی۔“

”اس نے مجھے خود کا لکھا کی تھی۔ وہ اپنی بہن کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے میری مدد چاہیے تھی۔ اس کا احسان تھا میرے اوپر۔ میں کیا کرتی۔“ وہ پشیمانی سے کہہ رہی تھی۔

”تم مجھے بتا سکتی تھیں۔ تم نے نہیں بتایا۔“ اس کی آواز دھیمی تھی اور نظریں کھڑکی کے پار ڈوبتی شام پہ جی تھیں۔ دونوں کے درمیان ایک آن دیکھی سی دیوار حائل تھی۔ یہاں کی تمام گز شترے ایسوں سے مختلف تھی۔ ماہی کو گا وہ اس دیوار کو کبھی پار نہیں کر سکے گی۔

”مجھے ڈر تھا کہ تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ گی۔“

اس نے جواب نہیں دیا۔

”مالا... آئی ایم سوری۔ مگر مجھے وہ مرانہیں لگتا۔ وہ ایک اچھا انسان ہے۔“

”اچھا انسان دھوکے سے کسی کی زندگی میں داخل نہیں ہوتے۔“

”لیکن وہ اتنا...“

مالا نے چہر موڑ کے اسے دیکھا تو ماہی کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اس کی نظر وہ میں کچھ تھا جو پہلے وہاں نہیں تھا۔

”مجھے ماہر فرید کی کہانی نہیں سنی۔ وہ مجھے یہ کہانی سنا چکا ہے۔ مجھے اس آدمی پر بالکل بھی اعتبار نہیں ہے۔ نہ کبھی

آئے گا۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”مالا تم اس بات کو ڈسکس کر کے کلیئر بھی نہیں کرنا چاہتیں؟“

”نہیں۔ مجھے اس بارے میں بات ہی نہیں کرنی۔ اور اگر تم چاہتی ہو کہ ہم اس بات کو یہیں دفن کر دیں تو ہم کبھی ماہر فرید کی بات نہیں کریں گے۔“

ماہی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”تم کہتی ہو تو میں آئینہ دہ اس سے بات نہیں کروں گی۔“

مالا نے کندھے اچکائے۔ ”تم آزاد انسان ہو۔ جس سے چاہو بات کرو۔ لیکن مجھ سے تم اس کا ذکر نہیں کرو گی۔“

”اوکے۔“ چند لمحے خاموشی سے گزرے۔ پھر ماہی نے ہمت کی۔

”تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟“

”نہیں۔“ وہ پھر سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

یہاں کی گزشتہ لڑائیوں جیسی نہیں تھی۔ پہلی دفعہ ماہی کو احساس ہوا کہ اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

روم نمبر ۵۵۵ زرد بیویوں سے روشن تھا۔ پھولوں کی تیز خوشبو ہر طرف بکھری تھی۔ وہ بیڈ پر پیچھے تکیوں کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سامنے بیڈ پرے پہ شنبم اس کی اشیاء سیٹ کر رہی تھی۔ اور چنگیز خاموشی سے دوسری طرف کھڑا تھا۔

”آپ کالیپ ٹاپ۔ گرافک ٹیبلیٹ۔ آپ کا پین۔“

ماہر کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ چپ چاپ اسے چیزیں رکھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”یہ ہی ڈاکٹر کی approve شدہ کافی۔“ اس نے مسکرا کے ایک کپ ساتھ رکھا۔ ”اب مجھے اجازت۔“

ماہر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے جاتے ہی چنگیز ہنکھارا۔

”اس کو فون نہیں کیا؟“ ابرو سے سانیدھنیبل پر دھرے ٹوٹی اسکرین والے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ ماہر نے شانے اچکا دیے۔

”مجھے اس کی ہمدردی نہیں چاہیے۔“

”تم اس سے ملنے جا رہے تھے۔ کم از کم اسے بتا دو کہ کیوں نہیں آئے۔“

”وہ میرا انتظار نہیں کر رہی تھی۔“ اس نے میک بک اسکرین کھولی۔ فنگر پرنٹ اسکنر پر انگوٹھا رکھا۔ وہ مکمل طور پر کام کی طرف متوجہ تھا۔

چنگیز باہر آیا تو وہ دونوں یوروپی سنگ ایریا میں اس کے منتظر تھے، سینے پپ بازو لپیٹنے کا حاجانے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”مجھے لگتا ہے تم سرکار سے ملنے ہوئے ہو۔“ یہ بل نے واہنٹ پیسے۔

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ شبنم بھی اسے گھور رہی تھی۔ یہ بل نے اچھبی سے اسے دیکھا۔

”تمہیں کیسے معلوم سرکار کون ہے؟“

”کیونکہ مجھے تم لوگوں کی ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں۔“ عینک ناک پر پیچھے کو دھیلی۔ ”آفس میں، ہسپتال میں، میں ہر جگہ تم لوگوں کے ساتھ ہوتی ہوں۔“

یہ بل نے ذہن میں جمع تفریق کی۔ ”اسی لیے ماہر تمہیں فائز نہیں کرتا۔“

شبنم نے مسکرا کے پلکیں جھپکائیں۔ پھر تاثرات بد لے خفگی سے چنگیز کو دیکھا۔

”ماہر بے کو آرام کی ضرورت تھی اور آپ نے کیا کیا؟“

”تمہیں اندازہ ہے اس کے لیے کام کا اسٹریس کتنا خطرناک ہو سکتا ہے؟“ وہ بھی اس پر غصہ ہوا۔

چنگیز جو صوفی پٹانگ پٹانگ جمائے بیٹھا تھا، دھیرے سے ہنس دیا۔

”تم جیسے نازک مزاج شہزادے کبھی کبھی ہسپتال کا رخ کرتے ہیں، میرے دوست۔ میں ان ہسپتالوں میں ہر

روز لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا ہوں۔“

(اب کمرے میں خاموشی تھی۔ سکون تھا۔ وہ اسکرین کو روشن ہوتے دیکھ رہا تھا۔ لیوں پر مدھمی مسکراہٹ ابھر کے معدوم ہوئی۔)

”ہم سب ماہر کو ایک عرصے سے جانتے ہیں۔ وہ کسی بھی حالت میں کام کرنا ترک نہیں کرتا۔ جب وہ اس لڑکی کا گارڈ تھا تب بھی وہ کام کرتا تھا۔“

(اسکرین کی تیز روشنی اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس نے کی بورڈ پر برائٹ نیس کم کرنے کا بٹن دھیرے سے دبایا تو محسوس ہوا کہ ہاتھ میں لرزش ہے۔)

”ماہر فرید کی آئندی میں لاکف کیا ہے؟ ایک پر سکون خاموش کمرہ۔ اس کا گرافک ٹیبلیٹ۔ ایک ہاتھ میں کافی۔ دوسرا میں پین۔ اور وہ بیٹھ کے سکون سے ایک نئی عمارت بنائے۔ میں نے اس کو گزشتہ ڈھانی برس میں کام کرتے ہی دیکھا ہے۔“

وہ دونوں خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ چنیز اب ٹانگ سے ٹانگ ہٹا کے اٹھا اور ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”کیا تم نے کبھی ماہر کو کام نہ کرتے ہوئے دیکھا ہے؟“
پیر بل نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”گزشتہ ڈھانی برس میں بالکل نہیں۔“
”کام کا ایک نشہ ہوتا ہے میرے بھائی۔ کام کا سوق کے اس کوڈو پا میں ملتی ہے۔ اسے لگتا ہے اسے ہسپتال میں مرضی کا ماحول ملے گا تو وہ کام کر لے گا۔ لیکن....“

”لیکن؟“
(روشنی کم ہوئی تو اس نے پلکیں زور سے جھپکائیں۔ پھر بر اوڑر کھولا۔ انگلیوں میں کپکاہٹ تھی۔ اس نے اسی میل باس کو فلک کیا۔ ایک دم اسکرین دھندا سی گئی۔ زور سے چکر آیا۔)
”لیکن وہ کام نہیں کرے گا۔ کرہی نہیں سکے گا۔“

”کیوں؟“
(ماہر نے آنکھیں زور سے میچیں۔ پھر انہیں کھوا تو منظر صاف تھا۔ اس نے نئی اسی میلوں کے ٹیکلیش پڑھنے چاہے لیکن الفاظ گذمہ ہونے لگے۔)

”کیونکہ سارے کام صحت کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔“

(نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ اس نے زور سے آنکھیں مسلیں۔ پھر میک بک اسکرین فولڈ کی۔ اور گرافک ٹیبلٹ اٹھایا۔ اسکرین روشنی کی۔ تیز روشنی آنکھوں کو چندھیا گئی۔)

”سر جری کی تکالیف، پین کلرز کا اثر، بیماری کا چڑچڑا پن۔ یہ ہو ہی نہیں سلتا کہ وہ فوکس ہو کے کام کر سکے۔ ہم اس کو جتنا منع کریں گے؛ وہ اتنا ہی چڑ جائے گا۔“

(اس نے پین سے اسکرین پر لکیر کھینچنی چاہی لیکن ہاتھ کا نپ گیا۔ سر کے سامنے والے حصے میں شدید درد اٹھنے لگا۔)

”اس لیے ماہر کو چند منٹ اپنی محبوب چیزوں کے ساتھ گزارنے دو۔ خود ہی باز آ جائے گا۔“
وہ مسکرا کے کھدرا ہاتھا۔

(اس کی آنکھیں سرخ گلابی ہو رہی تھیں۔ چند لمحے وہ اسکرین کو دیکھتا رہا۔ پھر سے پین اسکرین پر پھرنا چاہا لیکن دماغ خالی تھا۔ کوئی آئینڈیا، کوئی اسکیج، کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے دھیرے سے پین پرے رکھنا چاہا۔ وہ لڑھک کے نیچے جا گرا۔

”آہ....“، سر میں اٹھتا درد ناقابل برداشت تھا۔ اس نے کراتتے ہوئے سر پیچھے ٹکادیا۔ اور آنکھیں بند کر دیں۔)

”ابھی کچھ دیر میں وہ تمہیں بلائے گا اور یہ چیزیں لے جانے کے لیے کہے گا۔“ وہ اپ شبنم کو سمجھا رہا تھا۔ ”تم چپ چاپ وہ چیزیں وہاں سے ہٹا دو گی۔“

(وہ آنکھیں بند کیے زور زورے گھرے سانس لے رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کے گھنٹی بجائی۔)

”یہ تو بہت افسوس ناک صورتحال ہے، چینگیز۔“ بیربل کے چہرے پر فکرمندی ابھری۔ ”ماہر فارغ نہیں بیٹھا سکتا۔
ایسے تو وہ پا گل ہو جائے گا۔“

”اسی لیے تمہیں چاہیے کہ اس لڑکی کو یہاں بلا لو۔“

”تا کہ وہ مجھے سچ مجھ میں عاق کر دے؟ ہرگز نہیں۔“ وہ جھر جھری لے کر ایک طرف ہو گیا۔

”پھر اس کا برا موڑ برداشت کرو۔“ چینگیز نے گھری سانس لے کر شانے اچکائے۔ ”کچھ ہفتے۔ شاید کچھ مہینے۔“

”نہیں۔ ہمیں کچھ برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ بیربل کی آنکھیں ایک دم چمکیں۔

”یعنی؟“ اب جیران ہونے کی باری چنگیز کی تھی۔

”اسے کام کرنے کا شوق ہے نا۔ ہم اسے ایک کام تھا دیتے ہیں۔ اس کی زندگی کا سب سے اہم کام۔“ وہ اپنی مخصوص شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ اسی وقت گھنٹی کی آواز آئی تو شبنم تیزی سے اندر بھاگی۔ اگلے ہی لمحہ ایک ٹھہڑے کی آواز آئی۔

”انتابڑا ہسپتال ہے اور ایک تار آپ سے فکر نہیں ہو رہی۔“ چنگیز ماتھے پہ بل لیے ریسیپشن ڈیک کی طرف لپکا۔ ”اگر کوئی گر کے زخمی ہو گیا تو ہسپتال پہ مقدمہ ہو سکتا ہے۔“

”میں چار دفعہ یہ تار فکس کروں چکی ہوں، باش کو سربے۔ نہ جانے کون اسے بار بار گردیتا ہے۔“ وہ اب کے روہانی ہو کے بولی۔ چنگیز نے چونک کے پیر بل کی جانب دیکھا۔ پھر اس کی تیوری چڑھ گئی۔ جارحانہ انداز میں واپس اس کے سر پہ پہنچا۔

”یتم کرتے ہونا۔ اس کو گرانے کے لیے۔ اگر وہ سچ مجھ زخمی ہو گئی تو؟“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ ہسپتال والے خودنا اہل ہیں۔ اللہ اللہ....“ باری باری دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا اور شدید افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے ایک میگزین اٹھا کے چہرے کے سامنے کر لیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

مبین منزل میں ناشتے کی میز تھی تھی۔ چائے اور پرائھوں کی خوبصورتی کے ساتھ فضا میں ایک تناول بھی پھیلا تھا۔ مala اندرہ احمد سے سرجھکائے اپنی کافی پی رہی تھی۔ اور ماہی گاہے بگاہے ایک نگاہ اس پہ ڈالتی تھی۔

وہ بظاہر باہر جانے کے لیے تیار لگ رہی تھی۔ سامنے سے کھلا لمبا سا سوئٹر پہنے، بال آدھے کچھ میں باندھے، کانوں میں ٹاپس اور چہرے پہ ہلکا سامیک اپ۔ لیکن وہ کہاں جا رہی تھی۔ اس نے ابھی تک ذکر نہیں کیا تھا۔

”کہیں جا رہی ہو؟“ وہ سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”ہوں۔“ وہ سرجھکائے موبائل پہ بٹن دبارہ تھی۔ ماحول کا تناوبڑا ہنسنے لگا۔ ماہی نے پہلو بدلا۔

”شکور کا ایڈر ریس ملا؟“

”ہوں۔“

”مالا تم ابھی تک ناراض ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ بزرگوں میں کچھ نہیں تھا۔ نہ ناراضی نہ گل۔

”اگر ناراض نہیں ہو تو مجھ سے شیر کر سکتی ہو۔ جو بھی تمہیں بوجھل کیے ہوئے ہے۔“

”میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ یہ سب ختم ہو جائے۔ میری زندگی اس عامل کی قید سے آزاد ہو جائے۔ زیادتی امیٹھیک ہو جائیں۔ اور ہم سب نارمل ہو جائیں۔“

ماہی نے سر ہلا دیا۔ ”ہماری ماں تو چلی گئی۔ کاش اس کی ماں نج جائے۔“ اس نے دل سے دعا کی تھی کہ ماں میں سماجی بھی ہوتی ہیں۔

”مالا باجی... آج میں نے بڑی بی بی کو خواب میں دیکھا۔“

بخت بی نے ڈائینگ ہال میں داخل ہوتے ہی چہک کے بتایا۔

”کیا واقعی؟“ ماہی کا چہرہ کھل اٹھا۔ لیکن وہ جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ جیسے سانس لینا بھول گئی ہو۔
بخت بی اب جوش سے اپنا خواب سنارہی تھی۔ لیکن کشمکش میں ششدربیٹھی تھی۔

(تمہاری اور تمہاری ماں کی کہانی اب شروع ہوئی ہے۔)

وقت تھم گیا۔ ڈائینگ روم کا منظر وہیں جنم گیا۔ گھریوال کی سوئیاں بھی رک گئیں۔
اور پھر سوئیاں پیچھے کی طرف چلنے لگیں۔

کھڑکیوں کے باہر پھیلی صبح پچھلی رات میں بدلتی۔ پھر روشنی۔ پھر اندر ہمرا۔ یہاں تک کہ وقت چند ہفتے پیچھے جا کے رک گیا۔

اب کھڑکیوں کے باہر صبح کی جامنی سی روشنی پھیلی تھی۔

اندر کمرے سے عورتوں کے رو نے اور افسوس کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ حور جہاں کی میت کی خوبیوں بھی فضا میں تازہ تھی۔ اور وہ کچن کاؤنٹر کے سامنے پانی کا گاس لیے گم سی کھڑی تھی۔ نائٹ سوت پہننے کھلے بالوں کے ساتھ کشمکش کی اور جہاں میں تھی۔

سامنے ڈاکٹر سیلمہ کھڑی تھیں۔ کٹے بالوں اور ماتھے پہن گلاسز چڑھائے وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔

”میری ماں کی ڈیبتھ کے چند ماہ بعد میری سرجری ہوئی۔ جب مجھے آپریشن نیبل پہ لٹایا گیا تو....“

مالا نے بے تو جبی سے ادھرا دھردیکھا۔ وہ چاہتی تھی کہ چلی جائیں۔ یا چپ کر جائیں۔ اسے ان کے قصے میں دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن اسی پل انہوں نے کچھ کہا۔ کچھ ایسا کہ وہ چونک کے انہیں دیکھنے لگی۔

”.... تو آپریشن میبل پر میرے کانوں میں ایک آواز گوئی۔“

وہ بالکل ٹھہر کے انہیں دیکھنے لگی۔ ساکت، جامد۔

”اس آواز کے بارے میں میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم مجھے ایک سوال کا جواب دو۔“

وہ مزید قریب آئیں۔

وہ یک نک ان کو دیکھ رہی تھی۔ سارے آنسو اندر ہی اندر دم توڑ گئے تھے۔

”اگر ایک ماں سے میلے میں اپنے چھوٹے بچے کی انگلی چھوٹ جائے... اور وہ دونوں بچھڑ جائیں تو پہلے کون دوسرے کو ڈھونڈ لے گا؟“

”ماں بچے کو ڈھونڈ لے گی۔“ اس کے لب میکانکی انداز میں حرکت کیے۔

”درست۔“ سلیمانہ نے مسکرا کے سرا ثبات میں ہلا کیا۔

”لیکن اگر کوئی وہیل چیز پر موجود معدور بوڑھی ماں اپنی صحت مند جوان بیٹی کے ساتھ میلے میں جائے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو کھو دیں... تو پہلے کون دوسرے کو ڈھونڈے گا؟“

”بیٹی ماں کو ڈھونڈ لے گی۔“

”غلط۔ بالکل غلط، کشمائلہ۔“ ان کی آوز دھیمی ہوئی۔ ”تب بھی ماں پہلے اپنی بیٹی کو ڈھونڈ لے گی۔“

”کیسے؟ ماں معدور ہے۔ بوڑھی ہے۔“

”کیونکہ ماں ہمیشہ اپنے بچے کو ڈھونڈ لیتی ہے۔“

وہ بنا پلک جھپکے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں؟

”جن بچوں کی ماں ہیں مر جاتی ہیں، ان کو ایک راز تھمایا جاتا ہے۔ سب اس راز کو نہیں پاسکتے۔ کچھ اپنی ماں کے لیے اتنا روئے رہتے ہیں کہ ان کے آنسو ان کے اور اس راز کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن کچھ ہوتے ہیں..... میری طرح کے... جن کو وہ راز سمجھ میں آ جاتا ہے۔“

”کیسا راز؟“

”یہی کہ ماں اپنے بچے کو ہمیشہ ڈھونڈ لیتی ہے۔“

”مگر...“ اس کے لب پھر پھڑائے۔ ”میری ماں مر چکی ہے۔ میری اور میری ماں کی کہانی ختم ہو چکی ہے۔“

”اور اگر میں تمہیں کہوں کہ تمہاری اور تمہاری ماں کی کہانی اب شروع ہوئی ہے تو؟“
اس کا سانس جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ساری آوازیں خاموش ہو گئیں۔

”اب تک تم دونوں نے زندگی کا ایک حصہ ساتھ گزارا ہے۔ ماں سے شکوئے بھی ہوں گے۔ اڑائیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ ان کی فکر بھی کی ہوگی اور ان کے لیے دکھ بھی اٹھائے ہوں گے لیکن ان کی موت کے ساتھ سب ختم ہو گیا۔“

وہ سانس رو کے سن رہی تھی۔

”مگر تم دونوں کی کہانی ختم نہیں ہوئی۔ تمہاری اور تمہاری ماں کی غیر مشروط محبت کی کہانی اب شروع ہوگی۔“

”کیسے؟“ ایک آنسو آنکھ سے ٹپکا اور بے داغ چہرے پر پھسل گیا۔ ڈاکٹر سلیمان سمیت سارا منظر دھندا گیا۔

”انسان کی ایک طویل عمر ہے۔ جس کا ایک چھوٹا سا حصہ وہ اس دنیا میں گزارتا ہے۔ پھر وہ ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ان دو دنیاؤں کے درمیان ایک پرده ہے۔“

”جانتی ہوں۔ اور رو حیں اور ہر سے ادھر نہیں آ سکتیں۔“

”ہم روح کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ہاں رو حیں نہیں آتیں۔ لیکن پیغام آتے ہیں۔“
”پیغام؟“

”میں نے کہانا، کشمائلہ۔ ماں بچے کو نہیں بھولتی۔ وہ اپنے بچے کے ساتھ ساری عمر رہتی ہے۔ تمہاری ماں کہیں نہیں گئی۔ وہ اب بھی تمہارے ساتھ ہے۔ اب بھی اسے تمہاری فکر ہوگی۔ وہ تمہیں ضرور پیغام بھیجے گی۔ اور تمہیں اس کے بھیجے سارے پیغام ملیں گے۔ کبھی اپنے خواب کی صورت میں۔ کبھی کسی دوسرے تیسرے انسان کے خواب کی صورت میں۔ جب جب تمہیں ان کی ضرورت ہوگی، وہ تمہارے لیے کچھ بھیجیں گی۔“

”کیا وہ میری ماں ہوگی؟ یا وہ کسی کے ذہن کا تصور ہوگا جو خواب کی صورت میں آئے گا؟“

”تمہیں ان دونوں میں فرق کرنا خود آ جائے گا۔ ہمارے دین میں اس کو مبشرات کہتے ہیں جو ایمان رکھنے والوں کو دی جاتی ہیں خواب کی صورت میں۔ مبشرات یعنی اچھی خبریں۔ تمہاری ماں سے تمہارا تعلق ختم نہیں ہوا۔ اس کی اچھی خبریں تمہیں ملا کریں گی۔ اس کے پیغام بھی۔ دوسری دنیا میں آنے والی ہرئی روح سے وہ تمہارا احوال دریافت کریں گی۔ اور چونکہ وہ ایک نیک عورت تھیں، اس لیے مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے پیغام اور ان کی اچھی خبر تم تک ضرور پہنچائے گا۔“

اس نے بھیگا چہرہ اٹھا کے اور پرچھت کو دیکھا۔

”کیا واقعی؟ کیا ماں باپ کو مرنے کے بعد خواب میں دیکھنا ذہن کی اختراض نہیں ہوتی؟ کیا اس کا کوئی مطلب ہوتا ہے؟“

”آف کو رس ہوتا ہے۔ خواب کا فرشتہ کسی وجہ سے وہ خواب تمہارے ذہن میں لاتا ہے۔ ہر شخص کی وجہ مختلف ہوتی ہے۔ کسی کے خواب میں ماں باپ کا آنا صرف اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ خواب کو اہم جانے۔ کسی کے لیے اس میں نصیحت ہوتی ہے۔“

”کیا یہ بات میرا غم کم کر سکتی ہے؟“

”نہیں۔ یہ غم ساری عمر کا ہے۔ لیکن اتنا جان لو کہ تمہاری ماں زندہ ہے۔ مگر کسی اور دنیا میں۔ تم دونوں اس درمیان کے پردے کو نہیں توڑ سکتیں۔ لیکن خواب اس پردے کے درمیان سے گزرتے ہیں۔ تمہاری ماں انہی خوابوں کے ذریعے ہمیشہ تمہاری خبر گیری کرے گی۔ وہ عام خواب نہیں ہوں گے۔ وہ خیالات کا ہجوم نہیں ہوں گے۔ وہ نشانیاں ہوں گی۔ مامیں ساری عمر راستہ دکھاتی ہیں۔ چاہے اس دنیا میں ہوں۔ چاہے دوسرے دنیا میں۔“

”کیا ہر ایک کو اس کی ماں مرنے کے بعد خواب میں آتی ہے؟“

”ہر ایک کو نہیں آتی۔ صرف ان کو آتی ہے جو اپنی آنکھ کو صاف رکھتے ہیں۔ اتنا نہیں روتے کہ نظر دھندا جائے۔ گناہوں سے اس کو دھندا نہیں کرتے۔ وہ جو چھے ہوتے ہیں۔ انہی کو چھے خواب آتے ہیں۔“

”میری اور میری ماں کی کہانی ختم نہیں ہوئی...“ وہ بڑا ای۔ ”ماں مجھے دوبارہ ملیں گی۔“ پھر اسے کچھ یاد آیا۔

”آپ کو ہاسپٹل بیڈ پر کیا آواز آئی تھی؟“

”مجھے میرے کان میں میری ماں کی آواز آئی تھی کہ آیت کریمہ پڑھو۔ میں بالکل بھی نہیں تھی لیکن میں نے اسے پڑھنا شروع کیا اور اس روز میری جان جاتے جاتے بچی۔ شاید وہ آواز کسی فرشتے نے اختیار کی تھی یا کسی نیک جن نے۔ میں نہیں جانتی۔ لیکن میرے لیے وہ میری ماں کا پیغام تھا جو اللہ کے حکم سے میری طرف آیا تھا۔“ وہ آنسوؤں سے تر چہرہ لیے سن رہی تھی۔

”اب جاؤ اور اپنی ماں کو بہترین انداز میں دفن کرو۔ کیونکہ تمہارے گھر کا احوال ان کو کچھ عرصے بعد سبھی لیکن کسی نئی روح کے ذریعے مل ہی جائے گا۔ اگر تم روتنی رہو گی تو ان کو تکلیف ہو گی۔“

کشمائلہ نے گردن کو اشتافت میں جنبش دی۔ پھر شوروں سے ٹشوکھنیخ کے پھاڑا اور آنکھیں صاف کیں۔

کچھ تھا جو اس کے چہرے پر بدل گیا تھا۔

”میں نے خواب میں دیکھا کہ....“

گھریال کی سو بیاں تیزی سے واپس اپنی جگہ پر آئیں تو مبین منزل کا جما ہوا ڈائیننگ روم پکھل گیا۔ مالانے چونک کے بخت بی کو دیکھا جو جوش سے اپنا خواب سنارہی تھی۔

”میں نے دیکھا اور اللہ گواہ ہے کہ میں جھوٹ نہیں کہہ رہی، بے شک قسم لے لو....“

”اُف بخت بی۔ یہ ڈرامے نہ کرو۔“ ماہی بد مزہ ہوئی۔ ”ہمیں تمہارا یقین ہے۔ جلدی بتاؤ۔“

بخت بی ایکوشنل ہونے کا موقع نہ پاتے ہوئے اس سے زیادہ بد مزہ ہوئی۔ پھر جلدی جلدی اپنا خواب سنانے لگی۔

وہ ایک نیم اندر ہیر سا منظر تھا۔ بخت بی چلتی ہوئی لا ونج عبور کر کے گھر کا بیرونی دروازہ کھلوتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ لان میں حور جہاں کھڑی ہیں۔ صحت مند۔ ترو تازہ۔ انہوں نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی ہے اور ان کے شانوں پر گلابی اور سرمی رنگ کی شال ہے۔ بال چوٹی میں بندھے ہیں اور کلائیوں میں ان کے جڑا و نگن جگگار ہے ہیں۔

”بی بی جی آپ تو فوت ہو گئی تھیں۔ آپ کہاں سے آگئیں؟“ وہ حرمت سے ان کے قریب جاتی ہے۔
لان میں کھڑی حور جہاں نظر اٹھا کے اسے دیکھتی ہیں تو ان کی آنکھوں میں فکرمندی ہلکو رے لے رہی ہے۔

”ماہی سے کہو... گھر کی صفائی کرے۔“

”صفائی؟“ ماہی نے اچھنے سے اسے دیکھا۔ اور پھر مالا کو۔ وہ بھی متوجہ بیٹھی تھی۔

”صفائی تو روز ہوتی ہے۔“

”ماں کا خواب ہمیشہ ایک پیغام ہوگا۔ کوئی راستہ دکھاتا ہوا۔“ وہ بڑ بڑائی۔

”لیکن کہاں کی صفائی؟“ ماہی الجھی ہوئی تھی۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ ذہن کے پردے پر ایک منظر لہرا دیا۔ وہ دونوں کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔ وہ چھپتی ہوئی خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ سامنے بیٹھا اپنی کہانی سنارہا تھا۔

”میں نے آپ کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ ہمیشہ آپ کی حفاظت کی۔ کچھ با تیس آپ کو نہیں بتائیں۔ صرف اس لیے تاکہ آپ پر یشان نہ ہوں۔ جیسے اس روز جب ہم نے اسٹوڈیو کی صفائی مل کے کی تھی۔“

وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تب مجھے صفائی کے دوران ایک تعویذ ملا تھا۔ اس پہ چند ہنڈ سے لکھے تھے۔ وہ سرکار کی لکھائی تھی۔ میں اس لکھائی کو پہچانتا ہوں۔ اس کے علاوہ....“ اس کی آواز مضم ہونے لگی۔ منظر دھنڈ لا گیا۔

”کیف کو اسٹوڈیو کی صفائی کے دوران ایک تعویذ ملا تھا۔“ وہ دھیرے سے بولی تو ماہی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”تعویذ؟ کیا اس عامل نے ہمارے گھر کے اندر تعویذ پھینک رکھے ہیں۔“ اس نے بے اختیار اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ پھر تیزی سے گردن گھما کے قریب کاٹ میں سوتی حور کو دیکھا۔ ”ہم کہاں جائیں یا رہ؟“

”جب میں اسلام آباد سے واپس آئی تو ماہی بیمار ہو گئیں۔ مجھے کبھی گھر کی دیکھ بھال کا موقع نہیں ملا۔ ہمیں اپنے گھر کو ایک دفعہ مکمل صاف کرنا ہو گا۔ فرنپچر ہٹا کے۔ ایک ایک چیز ہٹا کے۔ یقیناً ہمارے گھر میں ایک عرصے سے بہت کچھ جمع ہوتا رہا ہے جو ہمیں نظر نہیں آیا۔ بلکہ ایسا کریں بخت بی۔“ وہ سوق سوق کے بول رہی تھی۔ ”ایک دفعہ سارے گھر کا فرنپچر نکال کے گھر کو دھو دیں۔ جادو گندگی میں رہتا ہے۔ گندگی میں نشوونما پاتا ہے۔ صفائی اس کو کم کرتی ہے۔ ہمیں ہر وہ چیز ڈھونڈنی ہو گی جو جادو کی نشانی ہے۔“

باہر کا ہارن ہوا تو وہ چونکی۔ پھر گھری دیکھی۔ زیاد پہنچ گیا تھا۔

”تم جاؤ۔ میں صفائی کروادوں گی۔“ ماہی آستینیں چڑھاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فضا کا تنا و خود بخوبی تحلیل ہو گیا تھا۔

”بڑا آرام کر لیا آپ نے۔ اب اپنی ساری بیٹیوں کو بلائیں۔ آج ہم اس گھر کو اوپر سے نیچے تک صاف کریں گے۔“

بخت بی کا چہرہ اتر گیا۔ جی بی بی کہہ کے آگے بڑھ گئیں۔ کچن میں آئیں اور ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کے پٹختن لگیں۔

اسٹریلائزر میں حور کے فیڈرز ڈالتی ہوئی بانو نے پلٹ کے انہیں دیکھا۔

”کیا ہوا ماں؟“

”مرے ہوئے کا خواب سناؤ تو ادا انعام دیتی ہے۔ یہاں کام مل گیا۔“ وہ بخت کبیدہ خاطر نظر آرہی تھیں۔

”تم نے واقعی بڑی بی بی کو خواب میں دیکھا تھا یا انعام کے لیے کہانی بنادی؟“ بانو مشکوک نظر وہیں سے انہیں

دیکھتی ان کے قریب آئی۔

”کہانی کیوں بناؤں گی؟ اللہ تم میں نے خواب دیکھا ہے۔“ پھر دائیں باعث میں دیکھا۔ اور آواز حصیمی کی۔ ”بڑی بی بی نے مجھے ایک بات اور بھی کہی تھی۔ لیکن میں نے نہیں بتائی۔“

”کیا بات؟“ بانو نے تجسس سے چہرہ قریب کیا۔ بخت بی سرگوشی میں بتانے لگیں۔ بانو کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

”خدا کو مانو، اماں۔ یہ بات نہ کہہ دینا ماہی با جی سے۔ المٹا نگ دیں گی تمہیں۔“

”ہاں ہاں اسی لیے نہیں بتایا۔“ وہ پلٹ کے برتوں والے سنک کی طرف بڑھ گئیں۔ ”پہلے کم کام ہیں جو اور پر سے سارا گھر صاف کریں۔ ہونہم۔“

زیاد کی کار پورچ میں کھڑی تھی اور ملا اس کی طرف بڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔ زیاد نے مسکرا کے اسے ہاتھ ہلا کیا تو وہ بھی مسکرا دی۔

اندر لا ونچ کی کھڑکی میں کھڑی ماہی نے یہ منظر بغور دیکھا تھا، یونہی کوئی کم بخت یاد آیا تھا۔

اس نے موبائل نکالا اور اس کا نمبر ملانے لگی۔ ریسیور کان سے لگایا ہی تھا کہ اس کا گھمیسر ہیلو سانی دیا۔

”کیسی ہو بینے؟“ کچھ بدلا ہوا ساتھا اس کی آواز میں۔ ”کیسی ہو سکتی ہوں؟ آپ کی وجہ سے میری اپنی بہن سے اڑائی ہو گئی۔“ وہ چھوٹتے ہی خفگی سے بولی۔ جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

”اچھا۔“ اور ایک گہری سانس۔

”آپ نے اس دن کال کی تھی۔ اور مالا نے دیکھ لیا۔“

”میں نے کال نہیں کی۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ”شاید کی ہو۔ یاد نہیں۔“

”آپ سور ہے تھے کیا؟ یا طبیعت خراب ہے؟“ ماہی کی نظریں گیٹ پہ جمی تھیں۔ زیاد کی کار باہر نکل رہی تھی۔

”کام کر رہا تھا۔ بتاؤ خیریت سے فون کیا ہے؟“ وہ اکتا یا ہوا سالگلتا تھا۔

”آپ نے کہا تھا آپ پاکستان آئیں گے... ماں کے افسوس کے لیے۔ آپ نہیں آئے۔ اور ہم دونوں نے مل کے اس پرzel کو حل کرنا تھا۔“ اس کے انداز پہ ماہی کا لہجہ بھی قدر سے رسی ہو گیا۔

”ابھی نہیں آسکوں گا۔ کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔“

”انتاضوری کام ہے کہ آپ اپنی زندگی کی سب سے بڑی مسٹری حل کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے؟ اور آپ نے کبیرہ تائی کی طرف بھی توجہ نہیں دی ہوگی۔ میں بتا رہی ہوں انہوں نے ہی سر کار کو ہار کیا ہے۔“

”اور مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ فی الحال میں کافی پھنسا ہوا ہوں۔ ان باتوں کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔“

”اچھی بات ہے۔ آپ اپنے کام کریں، اور یہاں وہ میری بہن کا دل جیت لے گا۔“ وہاب جھنجھلاسی گئی تھی۔
”کون؟“ وہ چونکا۔

”میرا ہونے والا بہنوئی اور کون؟“ وہ خفگی سے بولی تو وہ ہنس دیا۔

”اچھا وہ۔ ٹال، ڈارک اور ہینڈسم۔“

”ویسے وہ آدمی بر انہیں ہے۔ اچھا ہے۔ ڈینڈ ہے۔ اس کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے ملا اب اس کو انکار کر کے پچھتا رہی ہے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”آپ....“ ماہی نے ضبط سے دانت پھیلے۔ ”آپ اپنے کام کریں۔ اوکے بائے۔“
بڑا بڑا کے فون رکھ دیا اور بخت بی کو آوازیں دینے لگی۔



روم ۵۵۵ کے اندر سے سارے پھول اس صبح ماہر فرید کے حکم پر غائب کر دیے گئے تھے۔ جس وقت بیربل فرید اندر داخل ہوا، خالی کمرے نے اس کا استقبال کیا۔ آج یہ پکی تار فرش پر نہیں گردی تھی بلکہ دیوار پر نفاست سے چپکائی گئی تھی۔

ماہر اونچے تکیوں پر سر رکھے لیٹے ہوئے چھت کو دیکھتا کچھ سوچ رہا تھا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔

”کتنی عمارتیں ڈیزائن کر لیں تم نے؟“ بیربل قریب آیا اور ہاتھ میں کپڑا ایک پلنڈہ میز پر رکھا۔ اس نے جواباً ایک اکٹائی ہوئی نظر بیربل پر ڈالی اور کچھ تلخ سا کہنے لگا جب چونکا۔ نظریں اس پلنڈے پر جا ٹھہریں۔

”یہ تم کہاں سے لائے ہو؟“ چونک کے بیربل کو دیکھا۔ پھر میز کو۔ وہاں پرانی نوٹ بکس کا ایک ڈھیر رکھا تھا۔

”تمہارے لا کر سے۔“ بیربل مسکرا کے اسٹول کھینچ کے سامنے بیٹھا۔

”میرے لا کر کا پاسورڈ کیسے معلوم ہوا؟“

”تمہارے سارے پاسورڈ ہلال کی بر تھوڑے ہوتے ہیں۔“ ساتھ ہی زیر لب بڑا ہوا۔ ”سوائے تمہارے فون کے۔“

”اور میرے لاکر سے کتنے پیسے نکالے ہیں؟“ وہ مشکوک نظر وہ سے اسے گھور رہا تھا۔

”تو پہ تو بے...“ بیربل کے چہرے پر صدمہ ابھرا۔ ”تم مجھے اتنا گھٹیا سمجھتے ہو کہ تم یہاں بیمار پڑے ہو گے اور میں تمہارا لاکر صاف کر دوں گا؟“

”کتنے پیسے نکالے ہیں؟“ اس کی آواز بلند ہوئی۔

بیربل نے سر کھجالیا۔

”تحوڑے سے...“

”تحوڑے سے نکالے ہیں؟“

”نہیں۔ تھوڑے سے پچھے چھوڑے ہیں۔“ وہ ڈھنائی سے ہنسا۔

ماہر نے تکان سے پیشانی کو چھووا اور آنکھیں بند کیں۔

”کیوں صحیح صیحہ میرا دماغ خراب کرتے ہوئے؟“

”ایک آئینڈیا لایا ہوں۔“ وہ آگے کو ہو کے بیٹھا جوش سے کہنے لگا۔ ”تم کبھی بھی اتنے بد مزاج نہیں رہے جتنے آج کل ہو گئے ہو۔ کیونکہ تم زندگی میں پہلی دفعہ اتنے فارغ ہو کہ تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کرو۔“ وہ کوفت بھری آنکھوں سے بیربل کو دیکھے گیا۔

”تم کام کا اسٹریس نہیں لے سکتے۔ لیکن تم ایسا کام کر سکتے ہو جو تم کئی برس سے کرنا چاہتے تھے۔“

”تمہارا قتل؟“

”نہیں۔“ وہ برآمانے بغیر ڈھنائی سے مسکرا یا۔ ”سر کار کی تلاش۔“

”میں ہسپتال کے کمرے میں قید ہو کے اسے کیسے تلاش کر سکتا ہوں؟“

”تم تین ملکوں میں پھر کے بھی اسے تلاش نہیں کر سکے۔ شاید تمہیں اس کو اسی بند کمرے میں تلاش کرنا ہے لیکن اپنے دماغ کے ساتھ۔“ اس نے کپیٹ پانگلی سے دستک دی۔ ”تمہارا دماغ بہترین دماغ ہے ماہر۔ پھر بھی تم اسے تلاش نہیں کر سکے۔ کیوں؟“

اب کے وہ قدرے چونکے بیربل کو دیکھنے لگا۔ ماتھے کے بل ڈھیلے ہوتے گئے۔

”کیونکہ تم ہمیشہ اپنا کام ساتھ ساتھ کر رہے ہو تے ہو۔ تمہارا دماغ بٹا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب تم فارغ ہو۔ بالکل فارغ۔ تم اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہو۔“

ماہر نے ایک نظر میز پر کئے پنڈے کو دیکھا۔ دوسری اس پر ڈالی۔

”میں اتنے برس سے نہیں جان سکا کہ وہ کون ہے۔ اب کیسے جان پاؤں گا؟“

”کیونکہ تم ہمیشہ اسے کہیں دور تلاش کر رہے تھے۔ کیا معلوم وہ تمہارے بالکل قریب ہو۔“

(بیپتال کی میں انیٹرنس سے عبدالمالک فرید داخل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ سرمی سوٹ پہنے جیل لگے براق سفید بالوں اور بے تاثر چہرہ لیے وہ سیدھے لفت کی طرف آئے۔)

”کوئی ایسا انسان جو تمہیں بھی جانتا ہو اور کشمائلہ کو بھی۔ کوئی جو تم دونوں کی زندگیوں میں مشترک ہے، ماہر۔“

(مالک نے جیب سے ٹشوں کالا اور لفت کا بٹن پر لیں کیا۔ پھر بند دھاتی دروازوں میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے انتظار کرنے لگے۔ لفت نیچے آری تھی۔)

”اس نے پہلے ہماری فیملی کو نقصان پہنچایا اور اب وہ کشمائلہ کے پیچھے پڑا ہے۔“

(ماہی آستینیں چڑھائے ناک پر کپڑا پیٹھے اسٹوروم کے باہر کھڑی تھی۔ بخت بی، سلیم اور بانوں کے اس میں سے سامان نکالتے دکھائی دے رہے تھے۔ دفعتاً بخت بی کی چیخ بلند ہوئی۔ ماہی تیزی سے اندر آئی۔

ایک پرانے کمینیٹ کے اندر بکرے کا سر رکھا نظر آرہا تھا۔ جس کی آنکھیں غائب تھیں۔ ماہی نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھا۔ اسے زور کی ابکائی آئی۔)

”سر کار کسی وجہ سے تم سے نفرت کرتا ہے، ماہر۔ اسی نے تمہارا ایک سیڈنٹ کروایا ہے۔ وہ ایک بہت طاقتور انسان ہے۔ اس کے کائنات ساری دنیا میں پھیلے ہیں۔ عامل سے عقیدت مرید کے ایمان کا حصہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے عامل کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

(مالک لفت میں سوار ہوئے اور ٹشو سے بٹن دبایا۔ دروازے بند ہوئے اور لفت اوپر جانے لگی۔ وہ ہاتھ باندھ کر ہر اسکرین پر بدلتے نمبرز دیکھنے لگے)

”شاید وہ کشمائلہ سے بھی نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے اسے بھی نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔“

(کشمائلہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہاتھ میں موبائل پکڑے راستہ بتا رہی تھی۔ زیاد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی ہدایت کے مطابق کار کا موڑ کاٹ رہا تھا۔)

”لیکن کیوں؟ وہ تمہارا اور کشمائلہ کا دشمن کیوں ہے؟ ہم اب تک نہیں جان پائے۔“

(ماہی لان میں افسر دہ سی بیٹھی تھی۔ اس کے قدموں میں ایک چادر پچھی تھی جس کے اوپر چند چیزیں رکھی تھیں۔

بکرے کی سری۔ چند تعلویز۔ ایک گڑیا جس میں سویاں چبھی تھیں۔ چند رسیاں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سرخام لیا۔)

”سرکار ایسا دشمن ہے جو نظر نہیں آتا۔ ہم اس کو کسی پولیس، کسی شینکنا لو جی کے ذریعے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ ہم اس کو صرف ایک چیز سے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ تمہارے دماغ سے، ماہر۔“

(زیادا اور کشمائلہ ایک گھر کے باہر کھڑے تھے۔ ساتھ ساتھ بنے ان چھوٹے مکانوں کے گیٹ لو ہے کے تھے گلی کچی پکی تھی جس کے کنارے بنی نالیوں سے گٹر کا پانی ابل رہا تھا۔ کشمائلہ نے نیل پانگلی رکھی۔)

”وہ صرف تم سے ڈرتا ہے کیونکہ صرف تم ہو جو اس کو تلاش کر سکتے ہو۔“

(لفٹ کے دروازے کھلے اور مالک باہر نکلتے ہوئے دکھائی دیے۔ ریپشنٹ نے مسکرا کے سلام کیا۔ انہوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ چہرہ بے تاثر تھا۔)

”کیسے ڈھونڈوں اس دشمن کو جو نظر نہیں آتا؟“ وہ تلخ ہوا۔ ”کیسے تلاش کروں اس مجرم کو جو جرم کا کوئی سراغ نہیں چھوڑتا؟“

بیربل نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن اسی وقت دروازہ بنا دستک کے کھلا۔

دونوں نے چونک کے اس طرف دیکھا۔

عبدالمالک فرید چوکھ میں کھڑے تھے۔ بیربل فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ایک طرف ہو کے راستہ دیا۔ مالک اسے دیکھنے بنا آگے بڑھے۔ بیڈ کے قریب سے گزرے۔ اور کاؤچ پہ جا بیٹھے۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔ حمکتے سیاہ بوٹ میں کھڑکی سے آتی روشنی کا عکس تھا۔

”کیسے ہو؟“ اس کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تو چہرہ بے تاثر تھا۔

”کیا لگ رہا ہو؟“ ماہر نے شانے اچکائے۔

”دو مشینوں کے درمیان میرا کیا کام۔ میں باہر ہوں۔ تمام۔“ وہ ہنکھمار کے کہتے ہوئے خود ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کسی نے اس کو جواب نہیں دیا۔

”ٹھیک لگ رہے ہو۔“ مالک نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ ”ٹانگ ہی ٹوٹی ہے۔ ٹانگلیں ٹوٹی رہتی ہیں۔“

ماہر چند لمحے اس کا برف چہرہ دیکھتا رہا، پھر ملکا سامسکرا دیا۔

”ابا ہوتے تو بھی کہتے۔ نانگیں ٹوٹتی رہتی ہیں، ماہر۔“

مالک کے بیوی پر بھی بلکی تی مسکرا ہٹ ابھر کے معدوم ہوئی۔

”میں پہلے روز نہیں آس کا کیونکہ مجموع الفردان کے ساتھ میننگ تھی۔ کئی ماہ کی محنت کے بعد وقت ملا تھا۔“

ماہر نے سمجھنے والے انداز میں اثبات میں سر ہلا کیا۔

”اگر تم وہ میننگ چھوڑتے تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کرتا۔“

”جانتا ہوں۔“ مالک نے اپر واچکا کیے۔ ”قاسم نے بہت محنت کی تھی۔ میں اس کی محنت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔“

چند لمحے خاموشی سے گزرے۔ پھر وہ دھیرے سے بولا۔

”تم نے اس کاریستوران کیوں بکوایا؟“ اب کے اس نے مالک کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔

”وہ ایک بنس ڈیل تھی۔ تم نے خود سائیکل کی تھی۔“ وہاں ہنوز اطمینان تھا۔

”لیکن تم نے مجھے نہیں بتایا کہ یہ اسی کاریستوران تھا۔ تم نے پوری کوشش کی کہ میں یہ بات نہ جانوں۔“

”ہاں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔“ عبدالمالک فرید نے اسی لاپرواہ انداز میں شانے اچکا کیے۔

”کیوں؟ میں تمہیں الزام نہیں دے رہا۔ سمجھنے کی کوشش کر لے بارہ بھروسے ہوں۔“

”کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اس کی جا ب کرتے ہوئے جذبات کو درمیان میں لاو۔ اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ ہم نے اس کاریستوران بیچا ہے تو تم گلٹی فیل کرتے۔ جذبات درمیان میں آجائے اور جذبات بہت ظالم چیز ہوتے ہیں۔ سب خراب کرتے ہیں۔ لیکن....“ مالک نے ایک افسوس بھری سانس کھینچی۔

”لیکن تم پھر بھی جذبات کو درمیان میں لے آئے۔ اسی لیے تم آج تک یہ مسٹری حل نہیں کر سکے۔“ انہوں نے

میز کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کی پرانی نوٹ بکس رکھی تھیں۔

وہ سنجیدگی سے مالک کو دیکھے گیا۔

”تم کشمائلہ کو کیسے جانتے تھے؟ یہ مت کہنا تم اسے نہیں جانتے تھے۔ تم اس روز اس سے خود ملنے نہیں

گئے۔ پیر بل کو بھیجا۔ کیونکہ....“ وہ بغور مالک کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”کیونکہ تم اس سے مل چکے تھے۔ تم

نہیں چاہتے تھے کہ وہ تمہیں ماہر فرید کے حوالے سے جانے۔“ وہ یاد کر رہا تھا۔ مالک خاموشی سے اسے سنے گئے۔

”جب میں نے البتہ تمہیں دکھائی تھی، تم نے خود آفر کی کہ تم اس لڑکی کو ڈھونڈ دو گے۔ اور پھر تین دن میں تم نے

اس کوڈھونڈ نکالا۔ تم اسے پہلے سے جانتے تھے۔ مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا؟“

”جیسا کہ میں نے کہا... میں جذبات کو درمیان میں نہیں لانا چاہتا تھا۔“

”کس کے جذبات، مالک؟ میرے یا تمہارے؟“ وہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اس کی سرد آنکھیں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مالک نے کافی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ”تم آرام کرو، میں زارا کی طرف جا رہا ہوں۔“ پھر رک کے پوچھا۔ ”کیا وہ تم سے ملنے آتی رہتی ہے؟“

”ہوں۔“ وہ کسی اور دھیان میں تھا۔ اس کے لبھ پہ غور نہیں کیا۔ مالک دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ناب گھما کے کھولا۔ پھر وہیں رکے۔

ایک لمحہ ایسے ہی گزرا۔

”یہ وہ ہوتا ہے جسے جرم کا سب سے زیادہ فائدہ ہو۔“

”ہوں؟ کیا؟“ ماہر نے چونک کے اسے دیکھا۔

ڈور ناب پکڑے مالک فرید نے مڑکے اسے دیکھا۔

”میں اندر آیا تو تم پیربل سے پوچھ رہے تھے کہ ایسے مجرم کو کیسے تلاش کیا جائے جو جرم کا ثبوت نہیں چھوڑتا؟“ انہوں نے وقفہ دیا۔

”یہ وہ ہوتا ہے ماہر، جس کو جرم کا سب سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ تمہارا دشمن وہ ہے جس کو....“ اس کی پلستر لگی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کا سب سے زیادہ فائدہ ہوا ہے۔“

وہ یہ کہہ کے رکے نہیں۔ باہر نکلے اور اپنے پیچھے دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

وہ الجھ کے اس کی بات پہ غور کرنے لگا۔ اسی پل دروازہ دوبارہ کھلا اور سٹرائیک ٹرائی لیے اندر آئی۔

”آپ کے انجیکشن کا وقت ہو گیا ہے۔“ وہ مسکرا کے کہتی آگئے آئی۔ پھر مڑکے اس یمپ کو دیکھا۔

”تار دوبارہ نیچے گراؤں؟“ اس نے مسکرا کے سر گوشی کی۔

”کیا فائدہ؟ یہ لوگ پھر بھی آتے رہیں گے۔“ تلخی سے سرجھ لگا۔ پھر میز پر رکھی نوٹ بکس کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی لکیریں ابھر رہی تھیں۔



شکور کا گھر ایک تنگ گلی میں تھا۔ کئی جگہوں سے نالیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور گٹر کا پانی باہر ابل رہا تھا۔ زیاد احتیاط سے کار آگے بڑھا رہا تھا۔ وہ کبھی کچھ پکے راستے کو دیکھتی، کبھی اس کے چہرے کو۔

”سوری۔ میری وجہ سے آپ کو کیسی کیسی جگہوں پہ جانا پڑ رہا ہے۔“

”کیا میں آپ کو اتنا نازک لگتا ہوں کہ ایسی جگہوں پہ جانے سے ناک بھوں چڑھاؤں گا؟“ اس نے خفگی سے ملا کو دیکھا۔ ”میں صرف آپ کے لیے فکر مند ہوں۔ آپ ایسی جگہوں پہ تھا آتیں تو مجھے پریشانی رہتی۔“

”میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں۔“ وہ زیر لب مسکرائی لیکن بظاہر لا پرواہی سے شانے اچکائے۔

”میری ماں بھی ہر وقت یہی کہتی ہیں۔ مانتا ہوں آپ خواتین بہت بہادر اور خود مختار ہیں لیکن ہر جگہ عورتوں کے اکیلے جانے والی نہیں ہوتی۔“ اس نے کار ایک بزرگیٹ کے سامنے روکی۔

”کیا آپ کو شکور سے ملنے میں کوئی فائدہ نظر آ رہا ہے؟“ وہ بغور اس کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ یہ کیوں کر رہا ہے؟“

”اول تو وہ مانے گا نہیں۔ اور اگر مان بھی گیا تو رکے گا نہیں۔ کہیں آپ کسی نئے خطرے میں نہ پڑ جائیں۔“

”اب پیچھے مرنے کا وقت نہیں ہے۔“ وہ سیٹ بیلٹ کھولنے لگی۔ نظریں بزرگیٹ پہ جمی تھیں۔

”اپنی لوکیشن ماہی اور معید کو بھیج دیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ اس وقت کہاں ہیں۔“ وہ احتیار مسکرا دی۔

”آپ کی حفاظت کے پیش نظر کہہ رہا ہوں۔“

”جانتی ہوں۔“ وہ اسے سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یونہی زبان سے پھسلا۔

”شادی کی تیاریاں کہاں پہنچیں؟“ لبھے کو سر سری بھایا۔

”پھر پھونے کچھ شرائط رکھی ہوئی ہیں۔ پہلے وہ پوری ہوں گی۔ پھر معاملہ آگے بڑھے گا۔“ اس کے لبھ میں تلخی سی تھی۔ ملانے بغور سے دیکھا۔

”کیا آپ خوش ہیں اس شادی سے؟“

زیاد سلطان نے آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا اور زخمی سما مسکرا یا۔

”خوش تو میں صرف ایک انسان کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ اب تو بس زندگی گزارنی ہے۔ اپنے ماں باپ کی خوشی کے لیے،“ کچھ تھا اس کی آواز میں جو دل کو اس کر دینے والا تھا۔ پھر وہ کہہ کے رکا نہیں۔ دروازہ کھول کے باہر نکل

گیا۔

گیٹ دوسری گھنٹی پہ بھل گیا۔ ایک گھنٹی سے نوجوان نے باہر جھانکا۔ اس کی سیاہ موچھیں تھیں اور وہ زرد شلوار میں مبوس تھا۔

”کیا یہ شکور کا گھر ہے؟“ وہ جلدی سے بولی۔

وہ چند لمحے تجھ سے اسے دیکھتا رہا۔ ”میں شکور کا بیٹا ہوں۔“

”ہم اندر آ کے کچھ بات کر سکتے ہیں؟“

اس نے تحریر سے ان دونوں کو دیکھا۔ ایک سویٹر میں مبوس لڑکی جس کے بال آدھے کپھر میں بندھے تھے اور اس کے ساتھ کھڑا دراز قد آدمی۔ وہ دونوں منتظر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نوجوان نے ایک طرف ہٹ کے راستہ چھوڑ دیا۔

وہ اپنی نیوڈیلار سے احتیاط سے اوپر نیچے فرش پر قدم رکھتی آگے چلتی آئی۔ اسمیل بہت شدید آرہی تھی لیکن وہ ناک پہ باتھر کھکے بد تہذیبی کامظاہر نہیں کر سکتی تھی۔

سامنے ایک چھوٹا سا صحیح تھا اور اس سے آگے کمرے بننے تھے۔ باہر ایک طرف سنک لگا تھا جس کے نیچے بہت سا گٹر کا پانی کھڑا تھا۔ غالباً پیچھے کوئی باتھروم تھا جس کا ذریں اتنے ستم بند پڑا تھا۔ اسے متلبی ہونے لگی۔

نوجوان ان کو ایک بیٹھک نما کمرے میں لے آیا جہاں میلے کو روائے صوفے رکھے تھے اور ساتھ ایک چار پانی پچھی تھی۔

زیادا س کے برخیں آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے جا چکتی نظرؤں سے اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات کرنی ہے آپ کو؟“

کمرہ قدرے تاریک تھا۔ وہ دونوں سنگل صوفوں پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے اور وہ ان کے سامنے چار پانی کے کنارے پہ بیٹھا۔

”شکور کہاں ہے؟“ زیادہ نوز مشکوک نظرؤں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

نوجوان نے ایک دفعہ پھر باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھے۔

”میرا بابا پ شکور؟“ تجھ سے پوچھا۔

”ہاں۔ اس کو بناو۔ کہاں کے اسکول سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔“

”اس کو تو مرے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے ہیں، صاحب جی۔“

وہ دونوں جہاں تھے، وہیں رہ گئے۔ ساکت۔ ششدر۔

”شکور مر چکا ہے؟“ اسے اپنی آواز کسی کھانی سے آتی سنائی دی۔

”کب کا۔ تیسی لیٹ ہو گئے او۔“ وہ ہلکا سا ہنسا۔ ایسی بُنی جس میں تم سخرا تھا۔ تلخی تھی۔

”شکور کی موت کیسے ہوئی؟“ پھر وہ جلدی سے بولی۔ ”بہت... بہت افسوس ہوا۔“

”اصل میں جب میرے ابو کو اسکول کی جانب سے نکلا گیا تو...“

”تو وہ مڈل ایسٹ چلا گیا تھا اور وہاں نوکری کرتا تھا۔ معلوم ہے۔“ کشمائلہ نے جلدی سے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

لمحہ پھر کوچھ کا پڑا تھا۔

زیاد نے نگاہوں میں اس کو یا لیکس رہنے کا اشارہ کیا۔ ادھرنو جوان کہہ جا رہا تھا۔

”جی۔ اس کی اسکول والی نوکری کے جانے کے بعد ہمارے حالات بہت خراب...“

”وہ سب مجھے معلوم ہے۔“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس واقعے کا دوبارہ ذکر

کرے۔

”اس کی موت کیسے ہوئی؟“

”ہارت اٹیک ہوا تھا جی۔ لیکن آپ کیوں آئے ہو؟“

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سارے سوال اور جواب ختم ہو گئے تھے۔

”میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔“ نوجوان خود ہی باہر نکل گیا۔

”اگر شکور مر چکا ہے تو...“ اس کے جاتے ہی زیاد کے لب حرکت کیے۔

”تو وہ عامل نہیں ہے۔ لیکن پھر مجھے اس کا چہرہ کیوں دکھائی دیا؟“

”شاید وہ آپ کا گلٹی کا نشنس ہے؟“

کشمائلہ کی نظر میں جھک گئیں۔ سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

نوجوان واپس آکے بیٹھا تو ہاتھ میں چائے کی پیالیاں تھیں۔ ایک پیالی کا ہینڈل ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے ٹرے

سامنے رکھی تو وہ بے اختیار چائے کو دیکھنے لگی۔ یہ کڑک چائے نہیں تھی۔ نہ ہی ساتھ نان خطائی تھی۔ پھر بھی چار پانی

، گاؤں تکیے، اور اندر وون لا ہونے ایک ساتھ کچھ یا دکروایا تھا۔

”میں اسکول کی طرف سے ایک رپورٹ لکھ رہی ہوں تو مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“ اس نے سوئیٹر کی جیب سے نہیں سی نوٹ بک اور پین نکالا اور سرسری ساسوال کیا۔

”کیا شکور کوئی اور کام بھی کرتا تھا؟ یعنی دم درود ... تعویذ والا کام۔“

”نه جی۔ میرا باپ بڑا نیک تھا۔“ لڑکا بدک کے بولا۔ ”پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اور یہ دم درود تو سراسر جادو ہوتا ہے۔“ اسے جیسے یہ بات بری لگی تھی۔

”تمہیں کیا معلوم؟ تم پر دلیس میں اس کے ساتھ ہوتے تھے کیا؟“ زیاد نے مشکوک نظر وہ اسے دیکھا تو نوجوان کے ماتھے کی تیوری چڑھ گئی۔

”وہ ہمیشہ اللہ رسول کا نام لیتا تھا۔ میرا باپ ایسے کاموں میں ملوث نہیں تھا۔ اور نہ وہ چور تھا۔ اس کو کسی نے غلط الزام میں اسکول سے نکلوا یا تھا۔“

نوجوان اب تیز تیز بول رہا تھا۔ دکھ سے۔ احساس محرومی سے۔ وہ شکور کے ماضی کے بارے میں چند باتیں بتا رہا تھا۔ وہ سرجھ کائے غائب دماغی سے انہیں لکھتی گئی۔ ناک ابھی تک بوکی عادی نہیں ہو پا رہی تھی۔

”تم کیا کرتے ہو؟“ زیاد کی مشتبہ نظریں نوجوان پر جمی تھیں۔ دونوں نے چائے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

” محلے میں کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہوں۔ کسی سے بھی پوچھ لو۔“

اسی وقت باہر سے کسی نے آواز دی۔ ”کمیٹی والے گڑ صاف کرنے آئے ہیں۔“ نوجوان کے اٹھنے سے پہلے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلیں یہاں سے۔ شکور وہ آدمی نہیں ہے۔“ بدبو ایک دم شدید ہو گئی تھی۔ اس نے ناک پر ہاتھ در کھلایا۔

”چند سوال اور پوچھ لیتے ہیں۔“ زیاد ابھی تفتیش جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کو اب کائی تی آنے لگی۔

”کوئی فائدہ نہیں۔ میرا خواب جھوٹا تھا۔“ اس نے تلخی سے کہتے ہوئے ڈائری اسی صفحے سے موڑ کے جیب میں گھسادی۔ ڈائری جیب سے بڑی تھی۔ اس کا کونا باہر سے جھلنکے لگا۔ وہاں مالا کی لکھائی میں شکور کے بیٹھ کی کہی بات دکھائی دے رہی تھی۔

”خاندان والے ہمیشہ میرے باپ کا نداق اڑاتے تھے کیونکہ...“ اگلے الفاظ جیب کے اندر آنے کے باعث چھپ گئے تھے۔



بیربل فرید مسکراتے ہوئے ہسپتال کاریڈور میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک پھولوں کا گلدستہ تھا۔ چوکٹ پر رک کے اس نے چہرہ جھکا کے گلدستہ سونگھا۔ پھر مسکرا کے دروازہ کھوا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آج اس کی وجہ وہ تارنیں تھیں۔

کمرے کی وہ دیوار جو ماہر کے بیڈ کے سامنے تھی، اور شیشے کی اوپنچی کھڑکی دونوں اس وقت کاغذوں سے بھری نظر آ رہی تھیں۔ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا ماہر فرید کئی روز بعد ہشاش بشاش نظر آیا تھا۔ اس کی نوٹ بکس پھیلی تھیں اور وہ صفحے پھاڑ پھاڑ کے شبنم کو پکڑا رہا تھا۔

”اس کو وہاں لگاؤ۔ نہیں اس کے اوپر۔ ہاں ادھر۔“ وہ اس کی ہدایت کے مطابق صفحات چسپاں کر رہی تھیں۔

بیربل کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے وہ آگے آیا۔ گردن والئیں باکیں موڑ کے ایک ایک کاغذ کو دیکھا۔ پھر اسے جواب ایک دوسری نوٹ بک کھول رہا تھا۔

”یہ کیا ہے، ماہر؟“

ماہر نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ ہسپتال کی سفید اور نیلی شرت پہنے بال ماتھے پر بکھیرے، بڑھی شیو والا آدمی مسکرا یا۔ گال پر لگنے والے خشم کا نشان دیسا ہی تھا۔ البتہ آنکھوں کے گرد نیل مندل ہو رہے تھے۔

”وہی جو تم نے کہا تھا۔“

”میں نے کہا تھا مسٹری حل کرو۔ نہیں کہا تھا کہ تم ہسپتال کا کمرہ خراب کر دو۔ جرم انہی کر دیں گے وہ۔“ اس نے پھول میز پر کھے اور خنگی سے کھتا بیڈ کی پائیتی کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

”کیا میں نے تم سے رائے مانگی ہے؟“ وہ اب قلم سے ایک نوٹ بک پر نشان لگا رہا تھا۔

”مانگی ہوتی تو آج یہ حال نہ ہوتا۔“ بیربل نے پریشانی سے اسے دیکھا اور پھر دیوار پر لگے کاغذوں کو۔

”ماہر تم بھیک ہو؟“

جو ابا شبنم نے گھور کے اسے دیکھا۔ ”ماہر بے بھیک ہیں۔ بس میری ہمت جواب دینے والی ہے۔“

”جانتی ہونئی سیکرٹری ڈھونڈنا کتنا آسان ہوتا ہے؟“ سر جھکائے بولا تو شبنم نے ناک سکوڑا۔

”آج آپ ڈھونڈ ہی لیں نئی سیکرٹری۔ کیونکہ میں استغفاری دے رہی ہوں۔“

”تمہارے کانٹریکٹ کے مطابق تم دو ماہ کا نوٹ دیے بغیر استغفاری نہیں دے سکتیں۔ اس لیے یہ لو۔“ ایک اور کاغذ پھاڑ کے اس کی طرف بڑھا یا۔ ”اور اسے اوپر لگاؤ۔ ہاں شبابا۔“

”یہ سب ہے کیا؟“ بیربل نے اس کے قریب اسٹول کھینچا اور اس پر بیٹھتے ہوئے نسبجھی سے ان کاغذوں کو دیکھا۔

”یہ ایک اسٹوری map ہے۔ ہر وہ پیر انہل ایکٹیویٹی جو آج تک میرے ساتھ ہوئی ہے وہ میں نے ان نوٹ بکس میں لکھ کر رکھی تھی۔“ کمر تکیوں سے لگائے وہ ان کاغذوں سے بھری دیواروں کو دیکھتے ہوئے بتا رہا تھا۔ انداز بالکل نارمل تھا۔

”میں ان سب کو اپنے سامنے رکھ کے وہ ڈھونڈنا چاہ رہا ہوں جو ہمیشہ نگاہ سے اوچھل ہوتا رہا ہے۔“

”مجھے بھی سناؤ یہ اسٹوری۔ اور شہنم...“ بیربل پیچھے ہو کے بیٹھا اور ٹانگ پہ ٹانگ جمالي۔ ”میری ریگولر کافی پلیز۔“

اس نے خلافِ توقعِ جلدی سے ”تمام تمام“ کہا، کاغذ اور ٹیپ رکھی۔ اور پس اٹھائے باہر کی طرف بھاگی۔

”کشمالة اور میری کہانی اوشن کی فروخت سے ایک ہفتہ پہلے شروع ہوئی تھی۔ جب ہم چاروں اس ہوٹل سویٹ میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت میں اس عامل کو ڈھونڈ رہا تھا جو کشمالة کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔“

اس نے دیوار پر سب سے اوپر کر کے لگائے گئے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

”پھر؟“

”لیکن سرکار بہت شا طر تھا۔ وہ پہلے دن سے میری ہر حرکت سے گاہ تھا۔ اس نے کشمالة پر لفت میں حملہ کروایا اور میر الائٹر سے دیا۔ تاکہ وہ ماہر فرید تک پہنچ جائے اور یوں وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال دے۔ وہ ہمیشہ سے مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔“

”ہوں... آگے؟“ اب کے بیربل نے جمالي روکی۔ وہ یہ سب پہلے سے جانتا تھا۔

”میں کشمالة کے قریب کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ رہا تھا جو جادو میں ملوث ہو۔ اور تب مجھے کبیرہ سادان کے بارے میں علم ہوا۔“

”اور پھر تم اس کے عامل سے ملے اور اسے کہا کہ اب وہ کبیرہ کے لیے کسی پہ جادو نہیں کرے گا۔“ بیربل نے جلدی سے باتِ مکمل کی۔ پھر وہ چونکا۔ ”لیکن یقیناً وہ کسی نئے عامل کے پاس چلی گئی ہو گی۔ مارکیٹ میں عامل کم ہیں کیا؟“

”ہا۔ وہ واگہ بارڈر کے پاس ایک عامل کے پاس جاتی ہے۔“ وہ کاغذوں کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“

ماہر نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بے نیازی تھی۔

”کیونکہ اسے اس نئے عامل کے پاس میں نے بھیجا تھا۔“

پیر بل فرید کے چہرے پر حیرت بھری مسکرا ہٹ اور آنکھوں میں چمک در آئی۔

”ایک منٹ ایک منٹ... یہ تم نے کیسے کیا؟“ وہ بالکل سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ ساری بوریت غائب ہو گئی۔

ماہر نے گھری سانس لی۔ اور ہلکے سے شانے اچکائے۔

”میں اس کے عامل پیڑی مسح سے ملا اور...“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”دیکھو میرے ساتھ بد تیزی مت کرنا۔ ورنہ میرے موکل...“

پیڑی مسح نے ایک خوفزدہ نظر اس شخص پر ڈالی جو خود کو کیف کھلاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ میز کے کونے پر آگے ہو کے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں تم سے جو پوچھنے جا رہا ہوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔“ وہ پستول ہاتھوں میں گھمار رہا تھا۔ اس کا ملاقاتی تیاری سے آیا تھا۔

”پپ.... پوچھو...“

ماہر نے مو بال اسکرین اس کے سامنے کی۔ اس پر ایک گھنگھریا لے بالوں والی بچی مسکرا رہی تھی۔

”یہ کہاں ہے؟“

پیڑی مسح کی نظر میں بچی پہ جھکیں۔ پھر اس نے واپس ماہر کو دیکھا تو آنکھوں میں لا علمی تھی۔

”میں اسے نہیں جانتا۔“

وہ چند لمحے بالکل خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ گیا۔

”میں واقعی نہیں جانتا۔ مجھ سے قسم لے لویا...“

”تم واقعی نہیں جانتے۔“ اس کے چہرے پر مایوسی پھیلی۔ وہ جانتا تھا وہ بچ کھرد رہا ہے۔

”تم اسے ڈھونڈ رہے ہو؟“ صوفی میں دھنسے بیٹھے پیڑی مسح نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”اگر تم کہو تو میں...“ آواز حصیمی کی... ”اس کا پتہ کرو سکتا ہوں۔“

”مجھے اپنے کاموں کے لیے تمارے جنات کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے پستول پیٹر کے گھٹنے پر رکھا۔ اس کے آگے سانسلفر لگا ہوا تھا۔

”کیا... کیا کر رہے ہو؟“

”میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ صرف گھٹنوں میں گولی ماروں گا۔ تم زخمی ہو گے۔ اور چند ماہ ہسپتال میں رہو گے۔“ وہ اس کے اوپر جھک کے دھیرے سے بولا۔ ”اور زخمی عامل کسی کام کا نہیں رہتا۔ کوئی جادو ٹوٹی ہڈی نہیں جوڑ سکتا۔ نہ جادو گرا پنا وضندا چلا سکتا ہے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”کبیرہ تمہارے پاس کیوں آتی ہے؟“

”ایسے پوچھو نا۔“ پیٹر نے چند گھرے گھرے سانس لیے۔ ”اس کو اپنی بیٹی کا رشتہ ایک زیاد نام کے لڑکے سے کروانا ہے۔ اور اسے اپنی ایک رشتہ دار کی بیٹی ماہ بینہ کا بچہ ضائع کروانا ہے۔“

”اور؟“

”اور ہاں...“ وہ جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ ”ماہ بینہ کی ماں حور جہاں کی حالت کا بھی پوچھتی ہے کہ ٹیومر کتنا پھیل گیا ہے۔ وہ بیمار ہے نا تو....“

ماہر کے ابر و اچھبے سے اکھٹے ہوئے۔

”پوچھتی ہے؟“

”ہاں۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ بچے گی یا نہیں۔“ اس نے آواز مزید دھیمی کی۔ ”کسی نے حور جہاں پر بہت سخت جادو کر کھا ہے۔“

وہ دھیرے سے پیچھے ہوا۔ انکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں۔

”کسی نے؟ کیا کبیرہ تمہارے پاس حور جہاں پر جادو کروانے نہیں آتی؟“

پیٹر مسح نے پہلے ناٹھجی سے اسے دیکھا، پھر تیزی سے نفی میں سر ہالیا۔

”دنیں نہیں۔ حور جہاں کو میں نے بیمار نہیں کیا۔ نہ ہی کبیرہ نے ایسا کروایا ہے۔ اسے کسی اور نے بیمار کیا ہے۔ ناسود کا سخت ترین جادو ہے۔ وہ نہیں نجح پائے گی۔ کبیرہ تو بس اس کی حالت پوچھ کے مزہ لیتی ہے۔“

”اور کشمکالہ؟“ اس نے بغور اس کو دیکھا۔ ”اس پر کون عمل کر رہا ہے۔“

”ہم نہیں کر رہے۔ کوئی اور کر رہا ہے۔ ہم دوسرے کے کام میں مداخلت نہیں کرتے ورنہ ہم پر اثر آسکتا ہے۔ دیکھو جو میں کرتا ہوں وہ بتا دیا ہے۔ جو نہیں کرتا اس کا الزم صحنه نہ دو۔ وہ صرف ماہینہ کے بچے اور اپنی بیٹی کے رشتے کا جادو چاہتی ہے۔“

”ائزٹنگ۔ یعنی کبیرہ وہ نہیں ہے جو ہم سمجھ رہے تھے۔“ وہ بڑا بڑا۔ پھر سر جھٹک کے مایوسی سے اسے دیکھا۔ ”تم سرکار نہیں ہو۔ اینی ویز...“ اس نے اگلا لمحہ عمل بتانا شروع کیا۔

”تم اب کبیرہ کے کہنے پر کسی پر جادو نہیں کرو گے۔“

”اس سے کیا ہو گا؟ وہ صحیح چھوڑ کے کسی اور کے پاس چلی جائے گی۔“

”ہاں۔ اور اس کسی اور کے پاس اسے تم بھیجو گے۔“ وہ اب حصی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”تم یقیناً اس کی کسی دوست یا قریبی شخص سے واقف ہو گے۔“

”ہاں ہاں۔ اس کا آدھا سو شل سرکل میرے پاس آتا ہے۔“ پیغمبر نے پہلی دفعہ دانت نکالے۔ پھر اس کے تاثرات دیکھ کے اندر کر لیے۔

”تم کسی کے ذریعے اس تک ایک کہانی پہنچواؤ گے۔ واگہ بارڈر پر بیٹھے ایک بہت شاطر عامل کی کہانی جس کا کوئی عمل نہ کام نہیں ہوتا۔“

”واگہ بارڈر پر کون بیٹھا ہے؟“ وہ چونکا۔

”جو بیٹھا ہے وہ جادو گر نہیں ہے۔ میرا دوست ہے۔ اور تم کبیرہ کو اسی کے پاس بھیجو گے۔ میں تمہیں اس کے لیے پیسے بھی دوں گا۔ اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو...“ اس نے پستول کی نال اس کے گھٹنے پر دبائی۔ پیغمبر نے ہاتھ جلدی سے اٹھا دیے۔

”میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن اگر وہ جادو گر نہیں ہے تو وہ چند ماہ میں اسے چھوڑ کے کسی اصلی عامل کے پاس چل جائے گی۔“

”مجھے بس چند ماہ تک اسے مصروف رکھنا ہے۔ سمجھ گئے؟“

پیغمبر نے سر ہلا دیا۔ پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھا۔

”میں اس اڑکی کو ڈھونڈ سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو۔“

”کہانا۔ مجھے تمہارے جنات سے کام نہیں کروانے۔ میں اسے خود ڈھونڈ لوں گا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

”تم کہہ رہے ہو کہ کبیرہ ہماری ولن نہیں ہے؟ No way“، بیربل بد مزہ ہو کے پیچھے ہو بیٹھا۔

”وہ ایک گناہگار عورت ہے۔ لوگوں پر جادو کرواتی ہے۔ لیکن یہ جادو اس نے نہیں کیا۔ یہ سرکار نے کیا ہے۔“ وہ پھر سے سراٹھا کے اپنے کاغذوں کو دیکھنے لگا۔

”تم نے یہ بات کسی اور کو بتائی ہے؟“

”نہیں۔ اس کی بہن ہمیشہ کبیرہ پر شک کرتی ہے۔ لیکن وہ جذباتی سی لڑکی ہے۔ میں ایسی بات اس کو نہیں بتا سکتا تھا۔“

”لیکن تم نے مجھے بتا دیا۔“ بیربل فریڈ طمانیت سے مسکرا دیا۔ ماہر نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔

”کیونکہ مجھے اس وقت صرف تم متیاب ہو۔“

لیکن بیربل کی مسکراہٹ کم نہیں ہوئی۔ وہ دلچسپی سے اب دیوار پر لگے کاغذوں کو دیکھ رہا تھا۔

”اگر کبیرہ سرکار کی کائنٹ نہیں ہے تو پھر وہ یہ کیوں کر رہا ہے؟“

”یہی میں نہیں سمجھ پایا۔ وہ کشمائلہ کو کیوں فقصان پہنچانا چاہتا ہے۔“

”تم مزید کیا جانتے ہو سرکار کے بارے میں؟“

”یہی کہ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔ وہ سوق سوچ کے بتانے لگا۔“ سرپر نارنجی روکاں پہنتا ہے۔ اور اس کے بازو پر ایک نشان ہے۔“

ماہر نے اپنے بازو پر کہنی سے اوپر انگلی رکھی۔ ”اس جگہ پر۔“

”مزید کچھ؟“

”یہ کہ وہ بہت طاقتو رہے۔ بہت اثر و رسوخ ہے اس کے پاس۔ کسی وجہ سے وہ اپنی شناخت چھپاتا ہے۔ جیسے اپنے سامنے آنے پر اس کو بہت کچھ کھونے کا ذرہ ہو۔“

اتنے دن سے چھائی اکتا ہٹ اور بے زاری اب عنقا ہو چکی تھی۔ وہ بس خاموشی سے سامنے لگے کاغذوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان پر مختلف تاریخیں اور الفاظ لکھے تھے۔ جیسے نوش لیے گئے ہوں۔ عربی اور انگریزی کے ملے جلنے الفاظ جنہیں صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔

”تم اسے ڈھونڈ لو گے، ماہر۔ صرف تم ہو جو اسے ڈھونڈ سکتے ہو۔“ بیربل نے بہت مان سے کہا تو وہ ہلاکا سا

مسکرا یا۔

”تمہیں لگتا ہے میں اسے ڈھونڈ لوں گا؟“

”نہیں۔ صرف تمہیں خوش کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں تاکہ کمرے کا ماحول اچھا رہے۔“

وہ دھیرے سے ہنسا تو بیربل بھی ہنس دیا۔

”میں نے اس دن ساتھا جو تم کہہ رہے تھے۔“ چند ثانیے بعد وہ بولا تو آواز بلکی اور نظریں کھڑکی پتھیں۔ ”میں جانتا ہوں تم مجھ سے کبھی جیلیس نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں نے کبھی تمہاری بیکری کے لیے کوئی بڑا آرڈر نہیں بھیجا کیسی کار پوریٹ دوست سے تمہاری سفارش کی ہے۔ تم ایک اچھے بیکر ہو۔ اگر تمہیں کوئی آرڈر ملتا ہے تو تمہارے اپنے ٹیکنیک کی وجہ سے ملتا ہے۔“

بیربل مسکرا کے اسے دیکھے گیا۔

”اوکے۔ کر لیا میں نے یقین۔“ ساتھ ہی ہنس کے سر جھٹکا۔ جیسے وہ ماہر کو جانتا نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بیمن منزل کے سارے کمرے دھلے دھلانے لگ رہے تھے۔ کئی جگہوں پر گیلا پانی نظر آرہا تھا جو سردی کے باعث سوکھا نہیں تھا۔

آج گھاس پر بلکی سی ڈھوپ نکلی تھی اور ماہی اس ڈھوپ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تین روز سے جاری صفائی مہم کا اختتام کر رہی تھی۔

وہ باہر آئی تو لان میں چیز پہ بیٹھی، زیر لب مسلسل لا حول پڑھتی ماہی نے سراٹھا کے اسے دیکھا۔ پھر اس کا چہرہ روہا نسا ہو گیا۔

”اتنے عرصے سے ہم ان چیزوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ دیکھوڑا۔“

ماہی کے قدموں کے پاس ایک شیٹ بیٹھی تھی، جس پر بخت بی اور بانو چند چیزیں رکھ رہی تھیں۔ وہ انہیں ڈر ڈر کے کپڑے سے ہاتھ لگا رہی تھیں جیسے ان میں چھوت کا مرض ہو۔

بکرے کا سر۔ کسی جانور کے کٹے ہوئے سینگ۔ مرا ہوا اللو۔ چند تعویذ۔ ایک گڑیا۔ یہ چیزیں ایک جگہوں سے ملی تھیں جہاں سے روز صفائی ہوتی تھی۔

”باجی یہ جنات ڈال جاتے ہیں۔ یہ نظروں سے او جھل رہتی ہیں۔“ بخت بی نے اپنا حصہ ڈالا۔

”آپ نے کبھی ڈھنگ سے صفائی کی ہوتی تو پہلے نظر آ جاتیں۔ ماں بیمار کیا ہوئیں، آپ بھی ست ہو گئیں۔“
بخت بی کو تین دن سے ماہی سے ڈانٹ ہی پڑ رہی تھی۔ وہ پہلو بدال کے رہ گئیں۔ اندرہی اندر اپنا خواب سنانے پر شدید پچھتارہی تھیں۔ شکر ہے وہ دوسری بات نہیں بتا دی۔ ماہی نے تو اس کی جان نکال دینی تھی۔

”ان کا اب کیا کریں بی بی؟“ ایک طرف کھڑے سلیم نے خائف انداز میں پوچھا۔

”ان کو پانی میں ڈالنا ہو گا۔“ وہ لان کی گھاس پر چلتی ہوئی آگے آگئی۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا اور آنکھوں میں جیسے مایوسی سی تھی۔

”پانی میں؟“ ماہی نے ابر واٹھا میا۔

”ہاں۔ کیونکہ جادوئی چیزیں آگ کی تاثیر رکھتی ہیں۔ ان کو ہمیشہ پانی میں ڈال کے ٹھنڈا کرتے ہیں تاکہ ان کا اثر ختم ہو جائے۔ اور پھر بہادریتے ہیں۔ یہ بے اثر ہو جائیں گی۔“

وہ اس کے ساتھ ایک لان چیز پہ بیٹھی۔ چہرے پر تفکر تھا اور آنکھیں دھوپ کے باعث چند ہیار کھی تھیں۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ ماہی نے سوالی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ زندگی ایک دفعہ پھر بندگی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

”باجی... ویسے ہمارے علاقے میں ایک بابار ہتا ہے۔ بابا چھڑی والا۔ اس سے پوچھو تو چند منٹوں میں بتا دیتا ہے کہ جادو کب اور کس نے کیا۔ اگر آپ کہیں تو میں اس سے بات کروں؟“ بانو نے تجھیکتے ہوئے پوچھا۔
ماہی نے ایک بے بھری نظر ان چیزوں پر ڈالی۔ اور مالا کو دیکھا۔

”کیا ہم کسی سے پتہ نہیں کرو سکتے کہ یہ جادو کون کر رہا ہے؟“

”ہمیں ہماری ماں نے یہ نہیں سکھایا، ماہی۔“ وہ اس کو زمی سے دیکھ رہی تھی۔ ”ہمیں انہوں نے دین اور دنیا کی سمجھاں لیے نہیں دی تھی کہ ہم کسی عامل کی چوکھت پر چلے جائیں۔“

”لیکن مala...“ وہ پچکھائی۔ ”ہمیں اپنے دشمن کو کسی طرح تو ڈھونڈنا ہے نا۔ سخت مجبوری میں اگر ہم کسی عامل کے پاس چلے جائیں اور اس سے صرف اتنا پوچھ لیں کہ... یہ کس نے کیا ہے تو کیا برائی ہے؟ ہم اپنے دشمن پر جادو نہیں کروار ہے۔ صرف اس کا پوچھر ہے ہیں۔“

”عامل کیسے معلوم کرے گا؟ جادو کے ذریعے۔ اور یوں ہم اس جادو کا حصہ بن جائیں گے۔“

”لیکن...“

”تمہارے خیال میں کبیرہ تائی ان کاموں میں کیسے پڑی ہوں گی؟“
ماہی ایک دم چپ ہو گئی۔

”کیا وہ پہلے دن ہی کسی عامل کے پاس گئی ہوں گی اور کہا ہو گا کہ ماہ بینہ کے بچے پہ جادو کر دو؟ نہیں ماہی۔ یہ سب ایسے شروع نہیں ہوتا۔“ وہ اب خفگی سے اسے دیکھ کے کہہ رہی تھی۔

”یہ سب شروع ہوتا ہے سوالوں سے۔ کسی کے بارے میں کچھ ذرا سا معلوم کروانے سے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بے ضرر سا سوال ان کا ایمان خراب نہیں کرے گا۔ لیکن یہ آغاز ہوتا ہے۔ عاملوں کے دروازے پہ جانے والے قدم پھر کبھی واپس نہیں پلٹ سکتے۔ ہم وہ نہیں کریں گے جو کبیرہ تائی نے کیا۔ ہم اسے اپنی عقل سے ڈھونڈیں گے۔“ سختی سے کہہ کے وہ اٹھ گئی۔ ماہی نے سر جھکا دیا لیکن وہ مطمئن نہیں لگ رہی تھی۔

وہ اسے وہیں چھوڑ کے گھر کے پچھلے حصے میں آگئی۔ وہاں اجڑے ہوئے کچن گارڈن میں وہ قطع صاف دکھائی دیتا تھا جہاں سے گھاس ہٹا کے فاختہ کو فن کیا گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس بے نام قبر تک آئی اور یونہی گردن جھکائے اسے دیکھے گئی۔

کچن گارڈن میں اُگی خود رو جڑی بوٹیاں وہوپ میں سنہری لگ رہی تھیں۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کا رنگ بد لئے گا۔ یہاں تک کہ بہار کی گھاس بن گئیں اور اس گھاس کے پیچے ایک سرخ اینٹوں والی عمارت دکھائی دینے لگی۔

اوپنی پونی والی لڑکی تیز قدوں سے چلتی ایک راہداری کاموڑ مڑ رہی تھی۔ آگے ایک دروازہ تھا جسے کھول کے وہ اندر آئی تو سامنے با تھر و مزکی قطار نظر آئی۔ ایک طرف بڑا سا آئینہ بھی لگا تھا جس کے سامنے سنگ بننے تھے۔ دفعتاً ملاٹھبری۔ سنک کی طرف دیکھا جہاں گابی ہنسیر بینڈ والی لڑکی کھڑی تھی۔ آہٹ پہ وہ ایک دم ڈر کے مڑی۔ ہاتھ سے کچھ نیچے گرا۔ ملاکی نظریں جھکیں۔

اس کے پیروں کے قریب ایک سنہری گھڑی گری پڑی تھی۔ اس میں لگے نخے ڈانمنڈ دور سے چکتے دکھائی دیتے تھے۔

”یہ تو سرستار کی گھڑی ہے۔“ وہ چونگی۔ گابی ہنسیر بینڈ والی لڑکی جلدی سے جھکی اور گھڑی مٹھی میں دباتے ہوئے سیدھی ہوئی۔

”ہاں ہے۔ پھر؟“ اس کو دیکھ کے کندھے جھکلے۔

”سرستار صح سے اسے سارے اسکول میں ڈھونڈ رہے ہیں۔“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”یہ تمہارے پاس کیوں ہے؟“

وہ ہلکا سامسکرائی۔ پہلے واقع بیگ میں ڈالی اور زپ زور سے بند کی۔ پھر سینے پہ بازو لپیٹے اور کندھے دوبارہ اچکائے۔

”کیونکہ اب یہ میری ہے۔“

”ایسے مت کرو۔ وہ پریشان ہیں۔ ان کو واپس کر دو۔“

”ورنہ تم کیا کرو گی؟ ان کو جا کے بتاؤ گی؟“ وہ ہلکا سا بلسی۔ پھر سر دائیں باٹیں ہلایا۔

”سرستار کی اگلے ماہ پوسٹنگ ہو رہی ہے لیکن میں اگلے کئی سال تمہارے ساتھ اسی اسکول میں رہوں گی۔“ آگے تمہاری مرضی ہے۔ ویسے بھی کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ pimples۔ ”اسی بے پرواہی سے ابرو اچکائے۔“ اور اگر کسی نے میری تلاشی لینے کی کوشش کی تو میرے پاپا اس اسکول کی ایونٹ سے ایونٹ بجادیں گے۔“ وہ چند قدم آگے آئی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے چہرے کے بالکل قریب تھی۔

”تمہیں کیا معلوم کسی کے پاپا کیا ہوتے ہیں؟“ اور اس کے کندھے سے زور سے کندھا لکڑا کے آگے بڑھ گئی۔ اس کا سارا وجود بہل کے رہ گیا۔ اس نے بے اختیار مڑ کے ابھے جاتے دیکھا۔ پہلو میں گرے ہاتھ کی مٹھی بھینچ رکھی تھی اور کنپٹی کی نس ابھری ہوئی تھی۔

”تمہیں کیا معلوم کسی کے پاپا کیا ہوتے ہیں؟“ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

منظر بدلا اور اس کے چلتے ہوئے قدم ایک دوسری راہداری کے سامنے سے گزرے۔ سرستار آفس کے باہر کھڑے زور زور سے چلا رہے تھے۔

”وہ ڈائمنڈ واقع تھی۔ میرے مر جوم بھائی کا گفت۔ اور تمہارے علاوہ اسے کوئی نہیں اٹھا سکتا، شکور۔“

سفید بالوں اور پکی رنگت والا شکور نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

”نہیں سر.....“

”میں نے اسے خصو کے لیے اتارا تھا۔ میری غیر موجودگی میں صرف تم میرے آفس میں آئے تھے۔“

”سر جی قسم لے لیں، میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑے۔

”تم لوگ اور تمہاری جھوٹی فرمیں...“

کاریڈور کے ستون سے سر زکال کے وہ منظر دیکھتی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شکوراب ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ تھوڑی سے گرتے آنسو قیص کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

منظر بدلا اور وہ اب اپنا بیگ کندھے پہ ڈالے روشن پہ چلتی جا رہی تھی۔ سامنے سیدھی میں ایک گیٹ بناتھا۔ اسے دیکھ کے وہ رکی۔ شکورا اپنی سائیکل کو ہینڈل سے پکڑے گیٹ سے باہر زکال رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ آنسوؤں سے بھیجا چہرہ قیص کے دامن سے صاف کر رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

”شکور چاچا...“

اس نے پلٹ کے سامنے اسے آتی لڑکی کو دیکھا۔

”مجھے پتہ ہے آپ نے چوری نہیں کی۔ کسی اور نے کی ہے۔“ اس نے پھولی سانسوں کے درمیان خود کو کہتے سنایا۔

شکور آنسوؤں بھری آنکھیں لیے اسے دیکھتا رہا۔

”میں آپ کو اس کا نام بتا سکتی ہوں۔ آپ سرستار سے کہیں کہ اس کا بیگ چیک کروالیں لیکن میرا نام مت لججھے گا۔“

”جانتا ہوں... تمہاری کلاس کی لڑکی نے چوری کی ہے۔ وہی لڑکیاں دفتر آئی تھیں۔ لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ غریب کی کوئی نہیں سنتا۔“ وہ غصے میں ایک دم غرایا تو وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رو گئیں۔

”تم سب امیر لڑکیاں آپس میں ملی ہوئی ہو۔ اللہ عذاب نازل کرے گا تم سب پہ۔“

”مم میں نے چوری نہیں کی۔ میں صرف...“

”تم سب ایک جیسے ہو۔ ہمیشہ میرا مذاق اڑاتے تھے۔ آج مجھے چور بھی بنادیا۔ تم سب سے اللہ پوچھ جائیں۔“ نفرت سے پھنکا رتا ہوا وہ انگلی اٹھا کے کہر رہا تھا۔ ”میں لعنت بیجتا ہوں اس اسکول اور اس کی نوکری پہ۔“ سرخ چہرے کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے سائیکل باہر زکال لیا۔ وہ بالکل ساکت ہوئی اسے دور جاتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قدموں میں بچھی بے نام قبر سرما کی دھوپ میں روشن دکھائی دیتی تھی۔ مالا بھکی اور پنجوں کے بل وہاں بیٹھ گئی۔ نرمی سے مٹی پہ ہاتھ پھیرا۔

”تمہیں ایک بات بتاؤ؟“ وہ اداں مسکراہٹ سے کہر رہی تھی۔ ”اسی لیے مجھے معاف کرنا نہیں آتا۔ کیونکہ

مجھے بھی کسی نے معاف نہیں کیا تھا۔“

اس کا مرمریں ہاتھ دھوپ سے گرم ہوئی مٹی پر ابر چل رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

”کسی سے اپنے اوپر جاؤ کروانے والے کا معلوم کروانا گناہ کیوں ہے؟“

اس شام چڑچڑی سی ہوئی ماہی لیپٹاپ اسکرین کے سامنے بیٹھی تھی۔ اسکرین پر ڈاکٹر انڈ نظر آرہے تھے جو غالباً اپنے آفس کی کرسی پر بیٹھے تھے۔

”آپ پر بیشان لگ رہی ہیں۔“ اس سوال پر گھری سانس لے کر اسے دیکھا۔

”میرے گھر سے اتنی جادوئی چیزیں نکلی ہیں کہ میں بتانہیں سکتی۔ میں صرف جانتا چاہتی ہوں کہ یہ عامل کون ہے؟“

”آپ کو یہ جان کہ کیا ملے گا کہ جادو کون کرو رہا ہے؟“

”ہم اپنے دشمن سے دور رہیں گے۔“

”وہ پھر بھی جادو کرتا رہے گا۔ اس کو کیا فرق پڑے گا؟ البتہ آپ کا ایمان چلا جائے گا۔ ہم مسلمانوں کے پاس ایمان کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے؟“

وہ خاموش ہو گئی۔ تھوڑی ندامت سے جھک گئی۔

”سوری۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ مگر... ہم اس عامل کو ڈھونڈنے کے بہت قریب تھے۔ میری بہن کو خواب میں ایک چہرہ نظر آیا لیکن وہ جس آدمی کا تھا وہ کئی برس پہلے مر چکا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟“

”اس کی دو وجہات ہیں۔ پہلی یہ کہ انسانی دماغ خواب میں کوئی ایسا چہرہ نہیں دیکھ سکتا جو اس نے حقیقت میں نہ دیکھ رکھا ہو۔ یہاں تک کہ شیاطین بھی جب خواب میں ڈرانے آتے ہیں تو وہ کوئی ایسا چہرہ بنائے کے آتے ہیں جو ہم نے حقیقت میں دیکھ دکھا ہو۔“

”کیا واقعی؟“ اس کا منہ کھل گیا۔ ”لیکن جو لوگ خواب میں انبیاء کو دیکھتے ہیں، ان کا کیا؟“

”چونکہ آج کے لوگوں نے انبیاء کو نہیں دیکھ رکھا اسی لیے علماء کہتے ہیں کہ ایسے خوابوں پر یقین نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ البتہ یہ ایک روحاں پہلو ہے۔ میں سائنسی پہلو کی بات کر رہا ہوں۔“

”یعنی اگر میں نے کسی کا اصلی چہرہ نہیں دیکھا تو وہ خواب میں کبھی دکھائی نہیں دے گا۔“

”بالکل۔ انسانی دماغ کے لیے نیا چہرہ دیکھنا ممکن ہے۔“
وہ چند لمحے کے لیے بالکل حیرت زدہ تیپٹھی رہ گئی۔

”مطلوب... وہ عامل نہیں تھا۔ عامل کوئی اور ہے... لیکن پھر وہ خواب میں کیوں نظر آیا؟“

”کیونکہ دوسرا وجہ یہ ہے کہ عامل کبھی خوابوں میں نظر نہیں آتے۔ میں اپنی بات دہراتا ہوں آپ پہ جادو کرنے والا کبھی خوابوں میں نظر نہیں آئے گا۔ یہ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ خود عامل کا ہ پر دہر کھاتا ہے تاکہ انسان آپس میں فساد نہ کریں۔“

”یعنی شکور والاخواب بے معنی ہے؟“

”نہیں۔ خواب صرف نشانیاں ہوتے ہیں۔ ہنث۔ اشارے۔ وہ کبھی پیس آف کیک نہیں ہوتے کہ آپ دیکھتے ہی جان لیں کہ آپ کا مجرم کون ہے۔ وہ آدمی کسی اشارے کے طور پر نظر آیا ہو گا۔“

”ایسے خواب جس میں جادو کرنے والے کی طرف اشارہ ہو یا کوئی چہرہ نظر آئے اس پر فوراً یقین نہیں کرنا چاہیے؟“

”بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ علماء کہتے ہیں کہ ایسی چیزوں میں شیاطین کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ خود عاملوں کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کس پر کون جادو کر رہا ہے۔ اسی لیے ان چیزوں کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھنا چاہیے کیونکہ جنات جھوٹ بھی بہت بولتے ہیں۔ کسی غلط بندے کا نام بھی لے سکتے ہیں۔“

”اور اسی طرح خاندانی دشمنی اور فساد شروع ہوتا ہے۔“ اس نے سرا ثابت میں ہلا دیا۔

”اگر ہم خوابوں سے جانے لیں کہ ہم پر جادو کون کروار ہا ہے تو ہم اپنے قربی لوگوں کی جان ہی لے لیں۔“

”مجھے معلوم ہے میری ایک آنٹی ہم پر جادو کرواتی ہیں۔ لیکن کس سے کرواتی ہیں۔ میں یہ جانتا چاہتی ہوں۔“

”پھر آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ اس کا چہرہ سامنے لے آئے۔ اگر آپ کی دعا اس کے جادو سے بڑی ہوئی تو وہ ضرور سامنے آ جائے گا۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جادو گر کے تجسس میں نہیں رہنا چاہیے۔ اپنا دفاع مضبوط کرنا چاہیے۔“

ماہی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ فولڈ کر کے رکھ دیا۔

اس کے سر پر بندی چھت کے اوپر مالا کا اسٹوڈیو تھا۔ وہ وہاں تنہا کھڑی بڑی بڑی رائے ہوئے دیواروں پر لگے کاغذ اتار رہی تھی۔

”میرے خواب جھوٹے تھے۔ سب جھوٹ تھا،“ وہ بے بسی سے ایک ایک کاغذ کونوچ کے اتار رہی تھی۔ سامنے ایک کھلا کارشن رکھا تھا جس کے اندر ان کاغذوں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔

اس سے اوپر اس کی وہ چھوٹی نوٹ بک تھی جسے وہ شکور کے گھر لے کر گئی تھی۔ اس پاکھی تحریر واضح نظر آ رہی تھی۔

”خاندان والے ہمیشہ میرے باپ کا نداق اڑاتے تھے کیونکہ...“

مالا نے ٹھک سے کارشن بند کر دیا۔ اس کی تلاش ناکام گئی تھی۔ شکور اس کا مجرم نہیں تھا۔ وہ صرف اس کے ضمیر کی ایک پھانس تھا۔

دفعاً فون کی ٹون بجی تو اس نے اسی بے زاری سے موبائل نکالا۔ پھر زیاد کا نام پڑھ کے ما تھے کی شکنیں سیدھی ہونے لگیں۔ لبؤں پہ ایک مسکراہٹ خود بخواہت نے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

زیادا سے میسح بھینے سے چند منٹ قبل اپنے آفس میں بیٹھا، لیپ ٹاپ پر کام کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسی انگلیاں کی بورڈ پر چل رہی تھیں اور آنکھوں پر اسکرین گاسز لگے تھے۔ ساتھ ایک گرم کافی گریم کا فیگر کھا تھا جس سے اڑتی بھاپ آفس کی بنیں کی وہندہ حلی دیواروں تک کا سفر کر رہی تھی۔

دفعاً ساتھ رکھا موبائل زوں زوں کرنے لگا۔ اس نے اسکرین سے نگاہیں ہٹا کے دیکھا۔ نام دیکھ کے انگلیاں ٹھہر گئیں۔ ابو کا لانگ۔

ایک گہری سانس لے کر زیاد نے عینک اتاری۔ تھوڑی کھجائی۔ جیسے ہمت مجتمع کی ہو۔ پھر فون کا ان سے لگایا۔ ”جی ابو۔“ بیٹاشت سے پوچھا لیکن دوسری طرف کہے جانے والے الفاظ سن کے اس کی تھوڑی جھک گئی۔ چند لمحے وہ سنتا رہا۔ پھر اثبات میں سر ہلا کیا۔

”جی ابو...“ میں ابھی تک پھپھو سے ملنے ہیں جا سکا۔ جب سے آیا ہوں مصروف رہا ہوں۔ کبھی امی کو بہپتال لے کر جاتا ہوں۔ کبھی آفس کے کام دیکھتا ہوں۔“ وہ تھکا تھکا سالگ رہا تھا۔

دوسری جانب کچھ سخت کہا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تھکاوٹ بڑھنے لگی۔

”ابو میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔“ اس نے بدقت کہنا شروع کیا۔

”اور میں اب جو کہنے جا رہا ہوں وہ آپ کو دکھ دے گا۔ لیکن...“ تاک کی ہڈی کو انگلیوں میں مسلتے ہوئے

آنکھیں بند کیں۔ ”ابو میں علیشہ سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ میں یہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کو کبھی خوش نہیں رکھ سکوں گا۔“

دوسری جانب نامٹا چھا گیا۔ وہ ہمت کر کے کہتا گیا۔

”میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں، ابو..“ اس کی آواز بھیگ گئی اور سر جھک گیا۔ ”اور میں ساری عمر آپ کا دل جنتنے کی کوشش کرتا رہوں۔ لیکن اب میں تھک گیا ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں کسی لڑکی کی زندگی نہیں خراب کر سکتا۔ میرے دل میں کوئی اور ہے۔“

دوسری طرف سے ایک دم زور زور سے کچھ کہا جانے لگا۔ زیادتے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

”آپ جو بھی کہیں، ابو۔ میں صرف آپ کو خوش کرنے کے لیے یہ شادی نہیں کر سکتا۔ میں بچپن سے آپ کو ہی خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن میں بھی انسان ہوں۔ میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔“ اس نے رک کے سنا۔ چہرے پہ تکلیف پھیلی۔

”امی کوچھ میں مت لائیں، ابو۔ ان کا کیا قصور ہے؟ یہ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے کہہ رہا ہوں۔“ لیکن اس کے الفاظ درمیان میں ثوٹ لگئے۔ دوسری جانب سے مسلسل ابو کی تیز آواز گوختی سنائی دے رہی تھی۔ ”جی۔ میں جانتا ہوں، کشمائلہ نے انکار کر دیا تھا لیکن میں ایک دفعہ پھر اس سے بات کروں گا۔ کیا معلوم اب کی دفعہ وہ مان جائے۔ بالفرض وہ نہ مانی تب بھی میں علیشہ سے شادی نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں آپ کو خوش کرنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔“

موباکل میں سلطان صاحب کے زور زور سے چلانے کی آواز یہ آرہی تھیں۔ ”تم تمہاری ماں“ کے الفاظ سب سے واضح تھے۔

وہ تھمل لیکن کرب سے سنے گیا یہاں تک کہ وہ خاموش ہونے تو وہ دھیرے سے بولا۔

”امی کو آپ پہ مسلط کیا گیا تھا اور آپ کبھی خوش نہیں رہے۔ میں علیشہ کے ساتھ وہ سب نہیں کرنا چاہتا جو میری ماں کے ساتھ ہوا۔ سوری ابو۔ میں وہی آکے آپ سے پھر سے معافی مانگوں گا۔ لیکن ابھی مجھے اپنے لیے فیصلہ کرنا ہے۔“ اس نے فون رکھ دیا۔ آنکھوں میں بلکی تنی تھی جسے اس نے ہتھیلی کی پشت سے رگڑا۔

پھر موباکل پہ میتھج ناٹپ کرنے لگا۔

”کشمائلہ... کیا ہم کل مل سکتے ہیں؟ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ میتھج بھیج کے اس نے گہری سانس

لی۔ ہونٹوں پر بالآخر ایک امید بھری مسکرا ہٹ ابھری۔ اس نے فون رکھ کے واپس عینک لگالی اور انگلیاں کی بورڈ پر جمادیں۔



”شکور کے معاملے میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا، کشمائلہ۔“

”You were just a little girl.“

وہ گابی اور سفید رنگ سے تجھی ایک بوتیک بیکری تھی جس کے ایک کونے میں ریستوران ایریا بنایا گیا تھا۔ چھت سے اوپر نیچے سفید رنگ کے سجاوٹی پرندے لکھ رہے تھے۔ دوسرے کونے میں گابی چیری بلاسم کا نقشی درخت کھڑا تھا۔ غرض وہ ایک فیری ٹیل سی بیکری تھی۔

”کیا واقعی میرا قصور نہیں تھا؟“ وہ قائل نہیں ہو رہی تھی۔

وہ دونوں ایک کونے والی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ درمیان میں کافی کے دو کپ رکھے تھے۔ زیاد کے قریب ایک پلیٹ میں براؤ نیز نظر آ رہی تھیں۔

”پہلے بتائیں ... آپ واقعی براؤ نیز نہیں کھانا چاہتیں؟“ زیاد نے تجویز سے نکلا ٹوڑتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی اور سرفی میں ہلا کیا۔ اس کے کھلے بال ہوئے چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے اور اس نے سفید ہائی نیک سوئیٹر پہن رکھا تھا جس کے گریباں پر ایک لمبا شہر الا کٹ جھول رہا تھا۔ اس پر سیاہ رنگ کی فاختہ بنی تھی۔

”میں میٹھا نہیں کھاتی۔“ مسکرا کے یاد دلا کیا۔ البتہ اس کی آواز ادا س تھی۔

”کشمائلہ آپ ایک چھوٹی سی بچی تھیں جب آپ نے وہ کیا۔“ وہ آگے ہو کے بیٹھا اور فکر مندی سے اسے دیکھا۔

”آپ آج جیسی پر اعتمادورنگ وومن نہیں تھیں۔ آپ کلاس میں bully ہوتی تھیں اور آپ کی ذات میں باپ کی محرومی کا ایک خلاء تھا جس کی وجہ سے آپ کسی کو ناراض کرنے سے ڈرتی تھیں۔ الزام آپ نے نہیں لگایا تھا۔ آپ بس خاموش رہی تھیں۔ بچپن میں بہت سے بچے ایسے کرتے ہیں۔“

”ٹین ایچ میں۔“ اس نے تجویز کی۔

”ٹین ایچ میں بھی کرتے ہیں۔ شکور کی نوکری آپ کی وجہ سے نہیں سرستار کی وجہ سے گئی تھی۔ کیا اتنا عرصہ اس نے اپنی ایمانداری ثابت نہیں کی ہو گی کہ انہوں نے یوں اس پر الزام لگادیا؟ سرستار بڑے تھے، ان کو اس پر بھروسہ

ہونا چاہیے تھا۔“

”میں اس واقعے کو جستفا نہیں کر سکتی۔ میں نے غلط کیا تھا۔ اور میں اس غلط کو تھیک نہیں کر سکی۔ میں نے اسے ذہن کے کسی کونے میں دھکیل کے بھلا دیا۔“

”اور پھر؟“

”پھر میں نے اپنا سیکیشن بدلوا لیا۔ میں اپنے لیے کھڑی نہیں ہوتی لیکن میں اس جگہ سے خود کو remove کر لیتی ہوں۔ یہی میرا ڈینفس میکنزیم ہے۔ شاید اس لیے کہ میرا باپ نہیں تھا۔“ اس نے کافی کا کپ اٹھا کے لبوں سے لگایا۔ وہ کچھ زیادہ ہی کڑوی تھی۔

”باپ کے ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ ہم میں سے کچھ ساری عمر باپ کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ خوش نہیں ہوتے۔“ اس نے چونکے زیاد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر زمانے بھر کی ادا سی تھی۔

”آپ کے ابو...“

”میں نے علیشہ سے انكار کر دیا ہے۔ اور وہ اب سخت ناراض ہیں۔ لیکن میں اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا تھا۔ میں تحک گیا تھا۔“

اوپر سے لٹکتے سفید پرندے ہلکے ہلکے جھول رہے تھے۔ ان کی کاٹھ کی بنی آنکھیں ان دونوں پر جھی تھیں۔

”میں بھی تحک گئی ہوں۔“ مالا نے کپ رکھا اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ ”ان جادوؤں سے۔ ان تعویذوں سے۔“

”کیا آپ مزید اس عامل کو نہیں ڈھونڈنا چاہتیں؟“

اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے بنا نفی میں سر ہلا کیا۔

”میں اب لا ہو رہیں رہنا چاہتی۔ میں اس سب سے دور جانا چاہتی ہوں۔“

”پھر وہ کریں جو آپ کا دل کہتا ہے۔ چلی جائیں اس سب سے دور۔“ وہ رکا اور پھر جیسے ہمت مجتمع کر کے کھنکھارا۔

”میں بھی اس سب سے دور جانا چاہتا ہوں۔ میں بھی زخی ہوں اور اپنی healing ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے بھی اپنی ذات کو تند رست کرنا ہے۔ اور آپ کو بھی۔“

اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کے نا سمجھی سے زیاد کو دیکھا۔ لیکن وہ سمجھ رہی تھی۔

”کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہم ایک ساتھ خود کو heal کریں؟“
وہ چند لمحے سے دیکھتی رہی۔ ایسے ہی اس پل کوئی یاد آیا تھا۔ لیکن اس نے حلق میں آئے بہت سے آنسو نیچے دھکیلے۔ اس کو زیاد سے اس سوال کی توقع تھی۔

”کیا آپ اپنے والد کو ناراض کر کے خوش رہ سکیں گے؟“

”وہ تھیک ہو جائیں گے۔ لیکن آپ بتائیں... آپ کیا چاہتی ہیں؟“
ساتھ ہی اس نے جیب سے کچھ نکالا تو وہ چونکی۔ وہ ایک مخملیں ڈالی تھی۔

”میں آج آپ سے ایک دفعہ بھر پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ دنیا کے کسی دوسرے کو نہ میں جا کے اپنی نئی زندگی شروع کرنا چاہتی ہیں؟“
زیاد پہ جمی اس کی آنکھیں بھل گئیں۔

”مجھے نہیں معلوم زیاد۔ میں بس اس سب سے دور جانا چاہتی ہوں۔“

”تو میرے ساتھ چلیں۔ میں اور آپ مل کے ایک دوسرے کو heal کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں اپنی اپنی ذات کے کمپلیکس سے لڑتے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم پر فیکٹ نہیں ہیں۔ ہم دونوں کو اپنے اپنے باپ کی طرف سے چوٹ لگی ہے۔ لیکن جانتی ہیں... محبت سب سے بڑا مرہم ہوتی ہے۔“
وہ کہہ رہا تھا اور وہ اسے بھیگی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ کی محبت میرے زخموں کو بھرے اور میں آپ کو آپ کے ہمراہ سے نکالوں۔ کیونکہ محبت سب سے بڑا مرہم ہے اور یہی heal کر سکتی ہے۔“

وہ ہلاکا سامسکرا دی۔ بھر اس نے ڈبی اٹھا کے کھولی۔ اس کے اندر ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی۔
مالانے دھیرے سے ڈبی بند کی۔ زیاد سلطان کا سانس رک گیا۔

اس نے ڈبی اس کی طرف واپس دھکیلی۔ اور نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

”ہمارے ہاں منگنیاں ایسے نہیں ہوتیں۔ آپ کو اسے لے کر میرے گھر آنا ہوگا۔ وہ بھی اپنے والد کے ساتھ۔ میں کسی کو ناراض کر کے نیارشتہ نہیں بناسکتی۔“ وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں تکان بھی تھی اور امید تھی۔

”میرے دل میں آپ کی عزت اس بات سے مزید بڑھ گئی ہے۔ میں ابو کو لے کر آؤں گا۔“

پھر پلیٹ کی طرف دیکھ کے پوچھا۔ ”شیور آپ براؤ نیز نہیں کھانا چاہتیں؟“

اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلا دیا اور کافی کاگ اٹھایا۔ اوپر جھو لتے نازک پرندے خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔



نیند میں اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ چند لمحے کے لیے بیربل کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ پھر پلکیں جھپکائیں تو منظر قدرے واضح ہوا۔

سامنے بستر پہ ماہر لیٹا تھا۔ تکیے اور پر کر کے رکھنے کی وجہ سے اس کا سر قدرے اوپر نہ تھا۔ وہ خاموشی سے سامنے والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ بیربل نے آنکھیں مسلیں اور اٹھ کے بیٹھا۔ وہ کب کاؤچ پہ بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا، اسے یاد نہ تھا۔ وال کا کاک پہ نظر پڑی تو دیکھا، رات کے پونے تین بج رہے تھے۔

”ماہر... ابھی تک جاگ رہے ہو؟“

اس نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”ہوں؟“ وہ دور خلاء میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہا تھا۔

”کیا سوق رہے ہو؟“ وہ اٹھا اور روم فرتبح کی طرف آیا۔ ”پتہ نہیں کب ڈسچارج کریں گے یہ لوگ تمہیں۔“ بڑبڑاتے ہوئے فرتبح کا دروازہ کھولا۔ پھر پانی نکال کے پہنچا تو دیکھا وہ اسی طرح کہیں دور دیکھ رہا تھا۔

”اس کو کاک کرو یار۔“ وہ جیسے تحکم ہار کے کہتا واپس کاؤچ پہ بیٹھا تو ماہر چونکا۔

”کیا؟“

”اس کو کاک کرو۔ دوبارہ سے معافی مانگ لو۔ وہ تمہیں معاف کر دے گی۔“

ماہر دیہرے سے مسکرا یا۔ ”میں اس کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔“

”تم ایک سیڈنٹ سے پہلے اسی سے ملنے جا رہے تھے۔“

”وہ اور معاملہ تھا۔ میں اس کی ماں کا افسوس...“

”تو اسی کے لیے کاک کرو۔ ورنہ چند دن بعد معلوم ہو گا کہ اس نے کسی اور سے شادی کر لی ہے۔ کتنا انتظار کرے گی وہ تمہارا؟“

وہ ہلکے سے ہنس دیا اور سر جھکا۔

”کم از کم اس ناٹل اور ڈارک سے نہیں کرے گی۔ وہ اپنی کسی کزن سے شادی کر رہا ہے۔“ ماہی کی بتائی بات کو

بہت سکون سے آگے بتایا۔ بیربل نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”کیا وہ واقعی ہینڈ اسم نہیں ہے یا تم صرف اپنے جذبات کی وجہ سے کہتے ہو۔“

”واقعی نہیں ہے۔“

”وہ ہینڈ اسم ہو یا نہ ہوا سے وہ ہینڈ اسم لگتا ہے اور تم اسے کچھ نہیں لگتے۔“

بیربل تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو ماہر نے بڑا بڑا کر رہ گیا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہوا اس سب کا؟“ وہ چند ثانیے خاموش رہ کے تھک گیا تو دوبارہ اسے مخاطب کیا۔ اشارہ دیوار پہ لگے کاغزوں کی طرف تھا۔

ماہر نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔

”میں اسے کبھی نہیں ڈھونڈ سکوں گا۔ نہ تین ملکوں میں۔ نہ اپنے دماغ سے ایک کمرے میں۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔“

”پھر ان کاغزوں کو اتار دیتے ہیں ماہر۔ یہ تمہیں صرف ڈسٹرپ کر رہے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ماہر نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی جیسے تگ آ گیا تھا۔

بیربل دیوار تک گیا اور آہستہ آہستہ پیپر شیپ سے چکے کاغزوں تارنے لگا۔

”شکر کرو میں نے زارا کو یہاں نہیں آنے دیا۔ وہ یہ کاغز دیکھ لیتی تو اس کے سوال کبھی ختم نہ ہوتے۔“ وہ ایک ایک کاغذ کھینچ رہا تھا۔ ”ویسے مالک نے اسے کبھی تمہارے اور کشمائلہ کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟“

”مالک اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس کے ہر کام کی کوئی پیچیدہ سی وجہ ہوتی ہے۔“ اس نے بے زاری سے شانے اچکائے۔ پھر ایک دم وہ ٹھہر گیا۔

”مالک...“

”کیا؟“ بیربل نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ ہاتھ میں کاغزوں کا پلندہ تھا۔

”مالک...“ ماہر نے لیٹے لیٹے بیٹ کے ریموٹ کا بٹن دبایا۔ بیٹ سر ہانے والی طرف سے اوپر اٹھنے لگا۔

”تم نے اس دن کہا تھا کہ میں سر کار کو اس لیے نہیں ڈھونڈ سکا کیونکہ میں اسے بہت دور ڈھونڈ رہا تھا۔ کیا معلوم وہ بہت قریب ہو؟“ خود کار بیٹا ایک طرف سے اوپر چاہو گیا تو وہ اب بیٹھا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے پہ چونک جانے کا تاثر تھا۔

”ہمارے قریب ایسا کون ہے؟“ بیربل نے اچھبے سے اسے دیکھا۔
وہ بڑ بڑایا۔ ”مالک...“

”مالک؟“ بیربل کے چہرے پہ بے یقینی ابھری۔ ”ہرگز نہیں۔ تمہارا دماغ خراب ہے؟ وہ ایسا کچھ نہیں
کر سکتا۔ وہ تم سے بہت محبت....“

”مالک نے کہا تھا کہ مجرم وہ ہوتا ہے جس کو جرم کا سب سے زیادہ فائدہ ہو۔“ اس نے نیزی سے بات
کاٹی۔ بیربل جوش سے بولتے بولتے رک گیا۔

”مالک نے کہا تھا کہ میں اس کو اس لینے نہیں ڈھونڈ سکا کیونکہ میرے جذبات درمیان میں آگئے۔ مالک ٹھیک
کہہ رہا تھا۔“ وہ بے یقینی سے جیسے خود سے بول رہا تھا۔
بیربل آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھتا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ماہر... کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں درست تھا لیکن میں خود بھی یہ سمجھنے لگا کہ میں اپنے جذبات کی وجہ سے ایسے کہتا ہوں۔“
”کیا؟“

”یہ کہ زیاد سلطان ہندسم نہیں ہے۔“ وہ جیسے خود بھی چونکہ گیا تھا۔
ایک لمحے کے لیے بیربل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔
”تم... چنگیز... تم سب میرا مذاق اڑاتے تھے۔ تم سمجھتے تھے کہ میں جیلیسی میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ لیکن
نہیں، بیربل۔“ اس نے نفی میں سر ہالا یا۔ ”وہ بالکل بھی ہندسم نہیں ہے۔ مگر کشمکش کو وہ ہندسم کیوں لگتا ہے؟“
بیربل نے بے اختیار ماتھے کو چھووا۔

”رات کے تین بج رہے ہیں ماہر... تمہیں اب سو جانا چاہیے۔“
”شم بھی ہندسم نہیں تھا۔“

بیربل فرید جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ ساکت۔ جامد۔
”لیکن ہماری خوبصورت ماں نے ہمارے وجبہ بھائی کو چھوڑ کے اس سے شادی کی۔ یاد ہے وہ کیسے کہتی تھیں
کہ شمس بہت خوبصورت انسان ہے؟ اور ہم حیران ہوتے تھے؟“
کاغذ بیربل کے ہاتھ سے نیچے پھسل گئے۔

”شمس سر کار کا کائنٹ تھا۔ ہم صحیح رہے کہ اس نے ابا پہ جادو کیا ہے۔ ان کو بیماری کیا ہے۔ لیکن نہیں۔ شمس نے ہماری ماں پہ جادو کیا تھا۔ ابا کی بیماری اس جادو کا نتیجہ تھی۔“

”جیسے کشمائلہ کی ماں کی بیماری۔“ بیربل یک نک اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے کہا بیربل کو وہ کشمائلہ کو ہینڈ سم لگتا ہے۔ ایسا صرف دو صورتوں میں ہوتا ہے۔“ اس نے نوٹ بک اٹھائی اور تیزی سے صفحے پلٹنے لگا۔ ”پہلی صورت محبت ہے۔ اور کشمائلہ کو اس سے محبت نہیں ہے۔ اور دوسری صورت....“ ایک صفحہ کھول کے اس نے سامنے کیا۔

”سحر عشق....“

چند ثانیے کے لیے روم نمبر ۵۵۵ میں موت کا ستانا چھا گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

”سر کار زیاد اور کشمائلہ کی تصویروں پہ جادو ان کو جدا کرنے کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ وہ ان کو ملانے کا جادو کر رہا تھا۔ کشمائلہ نے اپنی ماں کی وجہ سے زیاد سے شادی سے انکار کیا تھا۔ اس کی ماں کی موت کا فائدہ صرف زیاد کو ہوتا ہے۔ وہ پاکستان اپنی کزن سے شادی کے لیے نہیں، کشمائلہ کے لیے گیا ہے۔“

اس نے نوٹ بک بیربل کی طرف بڑھائی۔ وہ بالکل گنگ ہو گیا تھا۔

”سر کار کا کائنٹ کوئی اور نہیں... زیاد سلطان ہے۔“ اس کو اپنی آواز دور کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”وہ ایک طویل عرصے سے سحر عشق کر رہا تھا۔“

بیربل نے نوٹ بک پہ چڑھ کر جھکایا۔

”سحر عشق کیا ہوتا ہے؟“



(سحر عشق کی ابتداء کب ہوئی، کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اس کی انتہا ہزاروں سال قبل سلیمان علیہ السلام کے دور میں ہوئی تھی۔)

زیاد سلطان باتھروم سے نکلا تو گیلے تو لیا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اپنے بال رکھتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

(دور سلیمان میں عموماً یہود کے جادوگر اس جادو میں ملوث ہوتے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ جادو اتنا عام

ہوتا گیا کہ کہ بہت سے مردوں نے اسے سیکھ لیا تھا۔)

زیادے نے پولو شرٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

(ہم عموماً سمجھتے ہیں کہ جادو عورتیں کرتی ہیں۔ لیکن سحر عشق وہ جادو ہے جسے تاریخ میں سب سے زیادہ مردوں نے استعمال کیا ہے۔)

اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرا یا۔

(یہ جادو عموماً وہ مرد کرتے تھے جو شکل و صورت میں بہت عام یا بد صورت ہوتے تھے۔ اور جب ان کا دل کسی ایسی خوبصورت عورت پر آ جاتا۔ جس کو وہ کسی جائز طریقے سے پانہ میں سکتے تھے تو یہ اس عورت کے اوپر سحر عشق شروع کر دیتے تھے۔)

اس کا عکس واپس اس کی طرف جھا نک رہا تھا۔

وہ ایک ایسا چہرہ تھا جو معاشرے کے خوبصورتی کے معیار کے پہ پورا نہیں اترتا تھا۔ وجہ اس کی رنگت نہیں، اس کے بے کشش نقوش تھے۔ چہرے پہ چھائی سنجیدگی اور کرختگی اس کو مزید ناپسندیدہ صورت بناتی تھی۔

(سحر عشق ہمیشہ حسین اور شادی شدہ عورتوں پر کیا جاتا تھا۔ حسین عوتیں زیادہ دیر تھا نہیں رہتیں۔ ان کی شادیاں جلد ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں یہ سحر عشق کی ابتدا اپنی محبوب عورت کو کسی میٹھے کھانے کا تخفہ بھیج کر تے تھے جس میں جادو ملا ہوتا تھا۔)

ٹیرس پر کھڑی لڑکی نے براؤنی کھاتے ہوئے نیچے دیکھا۔ اور پورچ میں کھڑے داڑ قدم آدمی نے سراٹھایا۔

(جادو کا پہلا اثر عورت اور اس کے شوہر کے قلعے پر تھا۔ عورت کو اپنا شوہر یا محبوب بد صورت یا جانور نما نظر آنے لگتا۔)

اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے زیادے نے پرفیو م اٹھایا اور خود پر چھڑ کا۔

(عموماً ایسے مرد یہ جادو کرتے تھے جو اس حسین عورت کے ہاتھوں مسترد ہو چکے ہوتے تھے۔ ایسے میں ان کا دوسرا قدم اس عورت کے ذہن سے جادو کے ذریعے اپنا پرانا تاثر منانا ہوتا تھا۔)

”ہم سہیل کی شایدی پر ملے تھے نازیادے۔“ ماہی کہہ رہی تھی۔ مالانے ہلکے سے کندھے اچکائے۔

”اچھا؟ مجھے یاد نہیں۔“

(جادو کا اثر ہونے کے کچھ دن بعد سحر کرنے والا جب محبوب عورت سے ملتا تو وہ اس عورت کو دنیا کا حسین ترین

مرد دکھائی دیتا۔ جسے وہ کشش سمجھتی وہ دراصل جادو کا اثر ہوتا تھا۔ یوں وہ مسلسل بیٹھے تختے دے کر اس جادو کو مزید راخ کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔)

”شیور آپ براؤنیز نہیں کھانا چاہتیں؟“

”میں آپ کے لیے چالپیس لا یا تھا۔“

”میں نے خواب میں دیکھا کہ...“ بخت بی بانو کو کان میں بتا رہی تھی۔ ”بڑی بی بی جی مجھے ایک دوسری بات بھی کہتی ہیں۔ کہ ماہی سے کھو اپنا خیال کرے۔ اتنا میٹھانہ کھایا کرے۔“

”تو بہ یہ بات نہ بتانا ماہی بی بی کو۔ پہلے ہی وہ اپنے بڑھتے وزن کے بارے میں پریشان ہیں۔ اس بات پر خوب برآمدنا کئیں گی۔“

زیاد نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے پرفیوم کی ڈبی واپس رکھی۔

سنگھار میز پر رکھا اس کا موبائل بجتنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھا اور فون کان سے لگایا۔

”جی سرکار..“ اس کا الجھ سی مرید کی طرح معتقد ساتھا۔

”کیا وہ مان گئی؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”جی سرکار۔ بالکل ایسا ہوا جیسا آپ نے کہا تھا، وہ ملکا ہما مسکرا یا۔

(لیکن سحر عشق کرنے والے جادو گر کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ بہت بھاری قیمت۔)

زیاد سلطان نے موبائل رکھا اور سنگھار میز پر رکھے کاغذ اٹھائے۔ وہ نگینہ بنگم کی روپورٹس تھیں۔

”قیمت تو میں ادا کر رہا ہوں۔“ وہ خود سے بڑ بڑایا۔ ”لیکن کشمکش میں کے لیے کچھ بھی۔“

اس نے روپورٹ دراز میں ڈال دیں۔ اور خود کار کی چابی اٹھائے باہر نکل گیا۔

مالا کے اسٹوڈیو میں رکھے ادھ کھلے کارٹن کے اوپر رکھی نوٹ بک کچھ کہہ رہی تھی۔

”سب میرے باپ کا مذاق اڑاتے تھے۔“ شکور کے بیٹھے کے الفاظ وہاں خاموشی سے رقم کیے گئے تھے۔ ”میرے باپ کا رنگ بہت کالا تھا۔ اور اسی وجہ سے سب اس کو بد صورت کہتے تھے۔ نوکری جانے کے بعد وہ دہنی چلا گیا اور سب رشتے داروں سے کشا گیا...“



اس اندر ہیر کمرے میں چوکڑی مارے بیٹھے جادو گر نے موبائل نیچے رکھا اور زیاد نام کی کال بند کی۔ پھر اپنے

سامنے رکھی چیزوں کو دیکھا۔ گڑیا۔ توعیز۔ زعفرانی روشنائی۔ اس نے مسکرا کے ان چیزوں کو ایک طرف کیا۔ اور پھر اپنی ٹانگیں دھیرے سے سیدھی کیں۔ اب اٹھنے کا وقت تھا۔

اس کے بوڑھے ہاتھوں نے کھڑے ہوتے ہوئے سر سے نارنجی رومال اتارا اور اسے ایک طرف ڈال دیا۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے اس نے کمرہ عبور کیا۔ ایک کونے میں کھونٹی لگی تھی جہاں ایک سفید لباس لکھتا دکھائی دے رہا تھا۔

سرکار نے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے اپنا میلا، گدالا لباس اتارا اور وہ براق سفید لباس پہنا۔ پھر لمبے سفید بالوں کو آہستہ آہستہ چوٹی میں گوندھنے لگی۔ جب چوٹی بن گئی تو اس نے سفید دو پٹھا کے سر پہ لپیٹا، تسبیح ہاتھ میں پکڑی اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ یہاں تک کہ سیڑھیوں کا اختتام ایک دروازے پہ ہوا۔ سرکار عرف مگنیز بیگم نے دروازہ کھولا تو باہر سے ڈھیر ساری روشنی اندر آئی۔ انہوں نے مسکرا کے دروازہ بند کیا اور اوپر آئیں۔

وہاں ایک صاف ستھرا سالا و نج بنا تھا۔ ایک کونے میں سلطان صاحب بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ عینک کے پچھے سے انہیں آتے دیکھا۔ ہاتھوں میں تنفس ابھر آیا۔

”اپنے کالے کاموں سے فرصت لے کر آگئی ہو، مگنیز بیگم؟“

وہ صرف مسکرائیں۔ کہا کچھ نہیں۔ اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ وہاں بنگالی ملازمہ کھڑی ان کی منتظر تھی۔ وہ سنک تک آئیں تو زور کی کھانسی آئی۔ سر جھکا کے سنک میں کھانسیں تو خون کے چند قطرے نیچے گرے۔ انہوں نے نل کھول لیا اور منہ پہ چند چھینٹے مارے۔

”زیاد کے لیے کچھ بھی...“ وہ بڑا بڑا ائمہ اور آگے بڑھ گئیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

استنبول شہر سے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیور پہ وہ ایک جنگل نما علاقہ تھا۔ صبح کا وقت تھا اور ابھی روشنی ہوئے زیادہ دیر نہیں بیٹی تھی۔

درختوں کے درمیان ایک طرف چند نوجوان بار بی کیو کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری طرف دو افراد بندوقیں اٹھائے باری باری اڑتے ہوئے مٹی کے کبوتروں کا نشانہ لے رہے تھے۔ ان میں سے ایک مالک فرید بھی تھے۔

گولی کی آواز کے ساتھ ہی ایک کبوتر چھنا کے سے ٹوٹا تو مالک نے بندوق نیچے کی۔ اور ساتھ کھڑے ادھیر عمر آدمی کو دیکھا جو اپنی بندوق کی نال سے ایک آنکھ بند کیے کچھ دیکھ رہا تھا۔

”میرے بھتیجے پہ حملہ کرنے والی کار کا سراغ ابھی تک نہیں ملا۔“ انہوں نے ناخوشی سے اپنی بات دہرائی۔

”ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میں تمہیں جلد اچھی خبر سناؤں گا۔“ اس نے بندوق نیچے کی اور مالک کے کندھے کو دھیرے سے تھپکا۔

”میں خود باش کو مسار چنگیز سے روپرٹ لے رہا ہوں۔ ہم حملہ آور کو جلد پکڑ لیں گے۔“ وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بار بی کیواں نینڈ سے اٹھتی دھونیں کی خوبصورتی کا لطف دو بالا کر رہی تھی۔

”ہاں وہ ماہر کا دوست ہے۔ اس کے لیے پوری کوشش کر رہا ہے۔“ مالک کے تاثرات ہمیشہ کی طرح برف تھے۔ ”لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اس معاملے کو حل کرنے میں اس سے بھی زیادہ قوت صرف کرو۔“

”میں نے کہا، ہم تم جلد اچھی خبر سنائیں گے۔“ وہ تسلی دے رہا تھا۔ ان کے جو گزر خزان رسیدہ پتوں کو رومند تھے آگے بڑھ رہے تھے۔

”تم بتا رہے تھے تمہاری بیٹی کی سالگرد ہے؟“

”ہاں۔ اگلے ہفتے تم آسکو گے؟“ ڈی جی صاحب نے مسکرا کے پوچھا۔

”نہیں۔ میں لندن والپس جا رہا ہوں۔ زار ضرور آئے گی۔“ وہ رکے اور آواز کو مزید سرسری بنایا۔ ”لیکن اگر تم نے کیک آرڈنر نہیں کیا تو نشانتاشی میں ایک بیکری ہے۔ میرے بھتیجے کی تم اس کوڑائی کر سکتے ہو۔“

”اچھا؟“ ڈی جی صاحب نے مسکرا کے انہیں دیکھا۔

”یعنی تمہاری مرضی ہے۔ آزمائے دیکھلو۔ لیکن میرا نام مت لینا۔ وہ سمجھے گا کہ میں.....“

وہ دونوں اب خشک پتوں پہ چلتے دور جا رہے تھے۔ آواز میں مدھم ہو گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(باتی آئیندہ ماہ ان شاء اللہ)